مغربی میڈیا اور اسلام



سہیل انجم

مغربی میڈیا اور اسلام

مصنف

سہیل انجم

ناشر

الکتاب انٹرنیشنل

مرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

نام کتاب	:	مغربی میڈیا اور اسلام
مصنف	:	سہیل انجم
تعداد	:	گیارہ سو
قیمت	:	100 روپے
ناشر	:	الکتاب انٹرنیشنل جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

ملنے کے پتے:

۱۔ مکتبہ ترجمان 4116، اردو بازار، دہلی-۶

۲۔ دار الکتب السلفیہ، مٹیا محل، دہلی۔۶

۳۔ نوائے اسلام 1146اے، چاہ رہٹ، جامع مسجد، دہلی۔۶

۴۔ دار المعارف محمد علی روڈ، ممبئی

۵۔ مکتبہ مسلم بربرشاہ، سرینگر، کشمیر

۶۔ حکیم صدیق میموریل ٹرسٹ، جودھپور، راجستھان

انتساب

والدۂ مرحومہ سہیمہ بیگم کے نام!

جو چند ماہ قبل اچانک ہم لوگوں سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں۔

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

فہرست مضامین

❊❊❊

پیش گفتار

پروفیسر اختر الواسع
ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

میڈیا مغرب کا ہو یا مشرق کا، اس کی اپنی طاقت ہے اور وہ طاقت بھی طلسماتی ہے۔ ایسی طلسماتی کہ بقول شاعر وہ جھوٹ کہہ رہے تھے مجھے اعتبار تھا۔ اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ایک بات جو ہر دور میں سچ ثابت ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ قلم گوید کہ من شاہ جہانم۔ قلم کی اس جہاں گیری اور جہاں داری ہی کا نام میڈیا ہے اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کو آج سے کوئی ایک صدی پہلے اکبر الہ آبادی نے یوں بیان کیا تھا کہ گر توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک صدی پہلے جب میڈیا کی یہ اہمیت تھی تو پھر آج کے محیر العقول اطلاعاتی انقلاب کے دور میں جب دنیا سے باخبری کے لئے خواندگی بالکل ضروری نہیں رہ گئی ہے، آپ خبروں کو اب پڑھتے نہیں، صرف سنتے بھی نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے باضابطہ دیکھتے ہیں اور آج انٹرنیٹ نے دنیا کی تمام معلومات کو ہماری آنکھوں کی پتلیوں میں اتار دیا ہے اور کوزے میں دریا یا گاگر میں ساگر اب محاورے نہیں بلکہ جانی پہچانی صداقتیں بن چکی ہیں، ایک ایسے خطرناک حد تک طاقتور میڈیم کو جسے کسی بھی سماج اور مملکت میں

چوتھا ستون کہا جاتا ہے، افسوس یہ ہے کہ مسلمان اس سے اس طرح گریزاں رہے کہ ان کی بات اس انداز سے دوسروں تک نہ پہنچ سکی جیسا کہ اس کا حق تھا۔ چند استثنائی کوششوں کو چھوڑ دیا جائے تو اس میدان میں مسلمان ہمیشہ پچھڑے ہی رہے اور اس کا فائدہ ہمیشہ ان کے مخالفین اٹھاتے رہے۔

آج اسلام اور مسلمانوں کی جس طرح گھیرابندی ہو رہی ہے اور انہیں جس طرح مطعون کیا جا رہا ہے اس میں معاندین اسلام نے میڈیا کو ہی اپنا ہتھیار بنایا ہے۔ مسلمان اس صورت حال سے بے حد مضطرب اور رنجیدہ ہیں اور بعض اوقات اجتماعی غیظ وغضب کا پیکر بن کر سامنے آتے رہے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ مسلمان عمل اور ردعمل کے اس چکر میں پھنس کر اور زیادہ مضحکہ خیز حد تک پریشانیوں کا شکار ہوئے۔ شاید یہی وہ صورت حال ہے جو زیر نظر کتاب کی تصنیف وتالیف کی بنیادی وجہ بنی ہے۔ اس کتاب کے مصنف ایک باشعور اور ہوش مند نوجوان اور مسلمان صحافی ہیں اور بحیثیت مسلمان انہیں اپنے ہم مذہبوں کی پریشانیوں کا بھی بخوبی اندازہ ہے اور بحیثیت صحافی وہ میڈیا کے انداز اور طریقہ کار سے آگاہ ہیں اور اس کا کس کس طرح استعمال اور استحصال ہوتا ہے، اس کا بھی انہیں خوب پتہ ہے۔ چونکہ سہیل انجم ایک اچھے صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ غیرت مند مسلمان بھی ہیں، اس لئے وہ اکثر اس صورت حال سے خود بھی پریشان ہو جاتے ہیں اور انہیں فطری طور پر غصہ بھی آتا ہے۔ یہ کتاب اسی واقعاتی صورت حال اور جذباتی کیفیت کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے مغربی میڈیا اور اسلام کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے آپ اس میں ان کے لہجے کی شدت کی شکایت تو کر سکتے ہیں لیکن انہوں نے حقائق کا جس طرح تجزیہ کیا ہے اس کی سچائی سے انکار نہیں کر سکتے۔

دراصل مغربی سامراجی طاقتوں نے اپنے استعماری عزائم کو کامیاب بنانے

کے لئے سب سے زیادہ جس قوت کا استعمال کیا وہ میڈیا کی قوت ہے اور انہوں نے اپنے منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے انتہاء یہ کہ علم و دانش کی حرمت کو بھی پامال کر دیا اور اسے استشراق کا نام دیا۔ جھوٹ، مکر و فریب، غلط تعبیرات، ادھوری سچائیاں اور ناقص اطلاعات، ان منصوبوں کے عناصر ترکیبی میں شامل ملیں گے۔ ان کو کبھی خبر و نظر کے نام پر تو کبھی تحقیق و تجزیہ کی صورت میں فروغ دیا گیا۔ اسلام اور مسلمانوں سے اس عناد کا رشتہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ بعثت نبوی ﷺ سے اب تک کا تاریخی فاصلہ ہے۔ اسلام کے خلاف (اس میں جناب رسالت مآب ﷺ کی ذات گرامی قدر اور قرآن حکیم بھی شامل ہے) اس مہم جوئی کو اقبال نے دو مصرعوں کے ذریعے بڑی خوبصورتی سے واضح کر دیا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

بات صرف اتنی ہے کہ انداز رومی و شامی بدلتے رہے ہیں مقاصد اور عزائم نہیں۔ اسلام اور عالم اسلام کے معاندین اور مخالفین کی پریشانی یوں بھی ہے کہ وہ اسلام کو جتنا دبانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اتنا ہی ابھر کر اور اوپر آتا ہے۔ اس صورت حال سے یہ اور زیادہ برہم ہو جاتے ہیں اور اس طرح کی کوششیں کرنے لگتے ہیں جن کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا اور کوئی تاویل پیش نہیں کی جا سکتی۔ سہیل انجم نے اس کتاب میں اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔ مسلمانوں میں معاشرتی اصلاح کی باتیں تو مختلف حوالوں سے کی جاتی ہیں لیکن ان کو مواقع نہ ملیں، اس کے لئے بھی ایک ماحول تیار کیا جاتا ہے۔ سہیل انجم کے قلم نے ایسی مثالوں کو پیش کرتے وقت جس انداز تحریر اور لب و لہجے سے کام لیا ہے وہ ان کے جذبوں کی سچائی کو ظاہر کرتا ہے۔

سہیل انجم سے مجھے ایک تعلق خاطر ہے اس لئے بھی کہ وہ بھی میری طرح علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے فیض یافتہ ہیں۔ اسی لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ سرسید کی طرح تھوڑا معروضی اور حقیقت پسندانہ رویہ ضرور اپنائیں۔ آج سوال یہ بھی ہے کہ قدرت کے دیئے ہوئے تمام بیش بہا وسائل کے باوجود عالم اسلام ایک متبادل مؤثر طاقتور اور عصری معیارات کے مطابق میڈیا کو کیوں نہیں جنم دے سکا۔ کیا وجہ ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں مسلمان اپنی بات کہنے اور دوسروں تک پہنچانے میں اتنے کامیاب نہیں ہوئے جتنا کہ انہیں ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کے جو ٹی وی چینل ہیں بھی، وہ ایک خاص قسم کی مذہبی مناظرہ بازی کے لئے وقف ہو کر رہ گئے ہیں۔ مسلمانوں کے مسائل ان کی ضرورتوں، ان کی کامیابیوں اور ان کے کارناموں کو ان چینلوں میں کوئی جگہ کیوں نہیں دی جاتی۔ کیا وجہ ہے کہ مسلمان دنیا بھر سے شکایتیں کرتے ہیں لیکن اپنی نئی نسلوں کو انگریزی اور دوسری زبانوں کے میڈیا میں بڑی تعداد میں بھیجنے کے لئے کیوں نہیں تیار کرتے۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہئے کہ جب تک میڈیا کے آپ قریب نہیں جائیں گے اور میڈیا کو آپ اپنے قریب نہیں لائیں گے اس وقت تک آپ کے مسائل ومصائب اپنی جگہ بنے رہیں گے۔ اس کے لئے اپنے اقلیت میں ہونے کو موردالزام قرار دینے سے بات نہیں بنے گی۔ آج دنیا کے مسلمان دلائی لامہ کے تبتی پیروکاروں سے کئی سو گنا زیادہ ہیں لیکن دلائی لامہ اور ان کے حامیوں نے میڈیا سے ایک رشتہ بنایا اور اس ربط وتعلق کو انتہائی موثر انداز سے اور سلیقے سے استعمال کیا۔ اور ہم نے دیکھا کہ دنیا کی سب سے کثیر آبادی اور بے پناہ سیاسی طاقت والے ملک چین کو اولمپک مشعل کے سلسلے میں تقریباً شکست دے دی۔ کیا وجہ ہے کہ ہم ایسا کوئی نظم نہیں بنا سکتے۔ آج مغربی میڈیا کے اسلام اور مسلمان مخالف رویوں اور پالیسیوں پر گفتگو کرتے وقت ہمیں ان سوالوں پر بھی

گمبھیر انداز سے سوچنا چاہئے اور کسی نہ کسی حکمت عملی کو وضع کرنے کی فکر کرنی چاہئے۔ یہ کام ظاہر ہے کہ وہی لوگ کر سکیں گے جو اس دنیا کے شناور ہیں۔ سہیل انجم نے یہ کتاب لکھ کر ایک طرح سے پوسٹ مارٹم کیا ہے لیکن اگر وہ اپنے مجھ جیسے خوگر مدح کو تھوڑے سے گلے کی اجازت دیں تو میں یہ کہوں گا کہ پوسٹ مارٹم مردوں کا کیا جاتا ہے، بیماروں کا نہیں' بیماروں کا تو علاج ہوتا ہے۔ ہمارا میڈیا اور ہم مسلمان دونوں بیمار کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کو ایک صحیح تشخیص کے ساتھ اچھے نسخہ شافی و کافی کی ضرورت ہے۔ سہیل انجم جیسے نوجوان ہی یہ کام کر سکیں گے۔

بہر حال سہیل انجم نے اس موضوع سے متعلق حقائق کو جمع کرنے میں جس محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے اور جس اہتمام سے (اور اس سے زیادہ شدت سے) ان کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس کے لئے میں انہیں مبارک باد دیتا ہوں۔ کیونکہ بہر حال آپ سہیل انجم سے اختلاف کرنے کے باوجود ان کے پیش کردہ حقائق کو مسترد نہیں کر سکتے۔ میری رائے میں اس کتاب کو اردو سے زیادہ انگریزی اور ہندی میں آنا چاہئے تا کہ انگریزی اور ہندی سے جڑے ہوئے میڈیا کے لوگ اس کے آئینے میں اپنا حقیقی چہرہ دیکھ سکیں اور انہیں بھی معلوم ہو کہ کہتی ہے ان کو خلق خدا غائبانہ کیا۔

❀ ❀ ❀

مغرب اور اسلام

ابن احمد نقوی

مغرب اور اسلام کی کشمکش دراصل عیسائیت اور اسلام کے درمیان صف آرائی سے شروع ہوتی ہے۔ حیات پاک نبوی علیہ التحیہ والتسلیم کے دوران ہی یہ صف آرائی شروع ہو چکی تھی۔ معرکہ موتہ، تبوک کی مہم، اور شہنشاہ روم (شام) ہرقل کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک، اسی صف آرائی کے چند پہلو ہیں۔ نامہ مبارک پانے کے بعد ہرقل نے عرب تاجروں کو دربار میں طلب کیا تاکہ عرب میں مبعوث ہونے والے نبی کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرے۔ ابوسفیان نے ہرقل کے سوالات کے جواب دیئے جنہیں سن کر شہنشاہ روم نے اعتراف کیا کہ اس نبی کا دین کامیاب ہوگا اور ایک دن میری سلطنت بھی اس کے زیرنگیں ہوگی۔ ہرقل اسلام قبول کرنے پر آمادہ تھا لیکن جب دربار میں نامہ مبارک پڑھا گیا جس میں ہرقل کو دعوت اسلام دی گئی تھی تو دربار کے مسیحی علماء نے شدید ردعمل کا اظہار کیا، ہرقل ان کی اس غوغا آرائی کو دیکھ کر گھبرا گیا اور اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اس وقت عیسائیت کا جزیرہ عرب کے اطراف میں غلبہ تھا۔ روم (شام) کی سلطنت، بازنطینی سلطنت مصر میں قبطی عیسائیوں کی سلطنت، یمن میں مسیحی حکمرانوں کا اقتدار، گویا جزیرہ عرب طاقتور عیسائی حکمرانوں کے نرغے میں تھا۔

خلافت راشدہ کے دور میں مسلمانوں نے یہ ساری عیسائی سلطنتیں فتح

کرلیں۔ ایران میں ساسانی حکمراں بھی مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا کر ختم ہو گئے اور اسلام کا علم ہر طرف لہرانے لگا۔ عیسائی اقتدار کے خاتمہ سے ان ممالک میں عیسائی مذہب کا غلبہ بھی ختم ہو گیا۔ مفتوح اقوام نے جو شہنشاہیت اور کلیسا کے جبر کا صدیوں سے شکار تھیں نئے مذہب کو برضا و رغبت قبول کرلیا۔ عرب شہنشاہیت کا پرچم لے کر نہیں آئے تھے نہ ان کا کوئی چرچ اور اسقف تھا وہ صحرائی (بدّو) تھے سیدھی سادی زندگی اور معاشرت کے خوگر، اسلام نے ان کی وحشت کو ہدایت میں بدل دیا تھا وہ اور ان کا معاشرہ مثالی تصویر پیش کرتا تھا اور یہی سب باتیں ان کی کامیابی کی ضامن بنیں۔

گرد و پیش کے تمام چھوٹے بڑے ممالک کو اسلام کے زیرِ نگیں لانے کے بعد پہلی صدی ہجری ۷۱۱ء میں مسلمانوں نے یوروپ کا رخ کیا۔ مشہور اسلامی جنرل طارق اپنے تھوڑے سے سپاہیوں کے ساتھ اسپین کے ساحل پر اترا۔ یہ بات بہر حال متنازعہ ہے کہ اس نے کشتیوں کو آگ لگا دی تھی لیکن اپنے سپاہیوں کو مخاطب کر کے اس نے جو تاریخی خطبہ دیا اس نے ضرور ان کے سینوں میں عزم و استقامت کے شعلے بھڑکا دیئے۔ ''ایھا الناس این المفر'' سے شروع ہونے والا یہ خطبہ بلاغت کا شہکار ہی نہیں اس عظیم جنرل کے عزم کا آئینہ دار بھی ہے۔ مُور (عرب مسلمانوں) نے اسپین پہنچ کر یوروپ کے اس تاریک خطہ کو علم و عرفان کے چراغوں سے روشن کیا۔ غرناطہ اور قرطبہ کی جامعات علم و فن کا گہوارہ تھیں مسلمان ہی نہیں مسیحی طلبہ بھی دور دراز علاقوں سے ان یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ قصر، قلعے، کتب خانے، مساجد، کالج، حمام، باغات کی فراوانی نے اسپین کے اس خطہ کو جنت نظیر بنا دیا تھا۔ عالیشان مکانات پختہ، صاف ستھری سڑکیں جن پر رات کو روشنی کا بہترین انتظام تھا جبکہ لندن اور پیرس میں اس وقت سڑکیں کیچڑ سے دلدل

بنی ہوئی تھیں رات کو عام طور پر تاریکی مسلط رہتی تھی۔ عصری تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں تھا کیونکہ کلیسا کے نزدیک مذہبی تعلیم کے علاوہ کچھ اور حاصل کرنا مسیحی عقیدہ کے خلاف تھا۔

وہ مسیحی سیاح اور جہاز راں جو ان مسلم سلطنتوں میں قیام کر کے آتے تھے وہ مسلمانوں کی ترقی خوشحالی اور پُر آسائش زندگی کی مسحور کن داستانیں اپنے اہل وطن کو سناتے تھے جنہیں سن کر لوگ نہ صرف مرعوب ہوتے تھے بلکہ ذہنی طور پر اسلام کی طرف راغب بھی ہوتے تھے۔ کئی مسیحی بادشاہوں نے مسلمانوں سے گہرے تعلقات قائم کر لئے تھے۔ ایک بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام سے اس قدر متاثر تھا کہ مسلمان ہونے کو بھی تیار ہو گیا تھا۔

اسپین کے افق پر اس وقت اسلام ایک ستارہ کی طرح جگمگا رہا تھا اور مسیحی خواص وعوام مسلمانوں کی ترقی اور خوشحالی کے سبب اسلام کو مسیحیت پر ترجیح دے رہے تھے۔ یہ صورت حال کلیسا کے لئے تشویش کا باعث تھی، وہ سوچ رہے تھے کہ اگر اسلام کی روشنی پھیلتی رہی تو کلیسا کا چراغ گل ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے تدارک کے لئے سنجیدگی سے قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ کلونی کے کلیسا کا بشپ واجب التعظیم پیٹر (Peter The Venerable) نے اس مقصد کے تحت غرناطہ کا سفر کیا، وہاں قیام کے دوران اس نے عربی زبان سیکھی اور پھر قرآن مجید کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ ظاہر ہے اسقف پیٹر کی نیت بخیر نہیں تھی، اس کا مقصد قرآن مجید کی تفہیم نہیں بلکہ اس کی تحریف تھی تاکہ عیسائیوں کو اسلام سے برگشتہ کیا جائے۔ عربی زبان پر کامل عبور نہ ہونے اور صرف ونحو (گرامر) پر پوری قدرت نہ ہونے کے سبب وہ بعض قرآنی آیات کے صحیح معنی اور مفہوم تک نہیں پہنچ سکا۔ یہ قرآن مجید کا پہلا ترجمہ تھا جو کسی مغربی زبان میں ایک غیر مسلم نے کیا۔ فتحپور سیکری (آگرہ)

میں اکبر کے عبادت خانے میں ہونے والی مذہبی بحثوں میں حصہ لینے کے لئے جو پرتگیزی پادری (سینٹ زبویرا اور اس کے ساتھی) گوا سے آتے تھے ان کے پاس پیٹر کا یہی لاطینی ترجمہ والا نسخہ ہوتا تھا جس کے حوالوں سے وہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک پر نازیبا حملے کرتے تھے۔

پیٹر کے اس تحریف شدہ ترجمہ کا عوام پر تو کوئی خاص اثر نہیں ہوا کیونکہ اس وقت مسیحی عوام تعلیم سے بے بہرہ تھے ہاں کلیسائی اور اس بالائی طبقہ میں جہاں تعلیم کا گزر تھا اس نے ذہنوں کو مسموم ضرور کیا۔ مسلمانوں نے اسپین میں اپنے سات سو سالہ دور اقتدار میں علوم وفنون، طب و جراحت، فلکیات، ارضیات، فلسفہ و منطق وغیرہ ہر میدان میں نئی راہیں کھولیں۔ قدیم اغریقی (یونانی) علوم کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ پرانے نظریات کو نئے اور توانا نظریات سے تقویت بخشی۔ بقول شہزادہ چارلس ولی عہد برطانیہ مسلمانوں نے قدیم یونانی علوم کو زندہ کیا۔ اور نئے نظریات سے آشنا کر کے انہیں نئی جہت عطا کی۔

طب (میڈیسن) میں ان کے کارنامے آج بھی روشن ہیں۔ طب مغربی (ایلوپیتھی) کی بنیاد ان ہی مسلمان اطباء کی تصنیفات پر ہے۔ بعض سیال دواؤں پر E1exir درج ہوتا ہے جو عربی الاکسیر ہے۔ جراحی (سرجری) میں اکثر آلات وہ ہیں جو اسپین کے مسلم طبیبوں نے ایجاد کئے۔ فن تعمیر میں قصر الحمراء، مسجد قرطبہ جیسی نادرۂ روزگار عمارتیں آج بھی عالمی وراثت کا حصہ تسلیم کی جاتی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ عرب مسلمان اس اجنبی سرزمین میں اپنی جڑیں مستحکم نہیں کر سکے۔ صلیبیوں نے انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ دوسری طرف محلاتی سازشیں، تخت نشینی کے لئے جنگیں اور اقتدار کے لئے اپنی گردن دشمن کے پنجہ میں دے دینے یعنی خودکشی کے جذبہ نے صحرانشینوں کے خیمہ اقتدار کی طنابیں توڑ ڈالیں۔

۱۴۶۹ء میں اراگون کی ملکہ ازابیلا اور کیسٹل کے بادشاہ فرڈی نانڈ کی شادی ہوئی اوران دونوں عیسائی ریاستوں کے اتحاد سے ایک نیا عرب دشمن محاذ وجود میں آیا۔ متواتر جنگوں اور طویل محاصروں کے بعد بالآخر ۱۴۹۲ء میں غرناطہ صلیبیوں کے قبضہ میں آ گیا قرطبہ پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اس طرح اسپین سے مسلم اقتدار کا ہی خاتمہ نہیں ہوا مسلمانوں کو بھی نیست و نابود کر دیا گیا۔ ہزاروں قتل کر دیئے گئے یا زندہ جلا دیئے گئے۔ جو تھوڑے سے باقی رہے انہیں غلام بنالیا گیا اور کچھ عرصہ میں اسپین مسلمانوں کے وجود سے خالی ہو گیا۔ اس طرح کہ اگر کوئی شخص ایسا کام کرتا جس میں نیل مرام کا امکان نہ ہوتو کہا جاتا تھا کہ یہ شخص اسپین میں محمد (مسلمان) کو تلاش کر رہا ہے۔ جسٹس سید امیر علی اپنی شہرہ آفاق کتاب دی سپرٹ آف اسلام میں مسلم اسپین کے سقوط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''مسلمانوں نے اسپین کو گلزار بنا دیا تھا عیسائیوں نے اسے ریگزار میں تبدیل کر دیا۔ مسلمانوں نے اسپین کی سرزمین کو اسکولوں اور کالجوں سے بھر دیا تھا عیسائیوں نے انہیں کلیساؤں میں بدل دیا جہاں ان کے اولیاء (سینٹ) اور دیگر بتوں کی پوجا ہوتی تھی۔ وہ علمی جواہر پارے جو مسلمان بادشاہوں نے جمع کئے تھے عیسائیوں نے انہیں نذر آتش کر دیا۔ مسلمان مرد عورتیں اور بچے بے دردی سے ذبح کر دیئے گئے جو تھوڑے سے بچ گئے انہیں غلام بنالیا گیا۔ جو وہاں سے فرار ہو گئے وہ افریقہ کے ساحل پر بھکاریوں کی طرح بے یارو مددگار پڑے تھے۔'' اس کے بعد سید امیر علی نے وہ تاریخی جملہ تحریر کیا ہے جو اپنی ندرت اور جامعیت کے اعتبار سے اسپینی عیسائیوں کی وحشت و بربریت اور سفا کی کا ابدی عنوان بن گیا۔ ''اسپینی عیسائیوں نے اندلسی مسلمانوں پر جیسے لرزہ خیز مظالم کئے ہیں انہیں بھول جانے یا معاف کر دینے کے لئے اسلام کو عیسیٰ اور محمد (علیہما السلام) کے مجموعی جذبہ عفوو درگزر سے کام لینا ہوگا۔''

It Would take the Combined Charity of jesus and Mohammad to make Islam forget or forgive the terrible wrongs inflicted by the christians upon the Andalusian. (P- 400)

اس سے بہت پہلے کلیسائی، یروشلم کو کفار (مسلمانوں) کے قبضے سے آزاد کرانے کے لئے کروسیڈ (صلیبی جنگ) شروع کر چکے تھے جو کم وبیش ڈیڑھ سو سال تک جاری رہے لاکھوں مسلمان اور عیسائی ان جنگوں میں کام آئے۔ جواہر لعل نہرو اپنی کتاب تاریخ عالم کی جھلکیاں (انگریزی) میں اس بارے میں تحریر کرتے ہیں ''ایک اور واقعہ نے اس وقت کے صلیبی یوروپ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ بیشتر عیسائیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ پہلے عیسوی ہزارے (ملینیم) کے خاتمہ پر دنیا ختم ہو جائیگی کیونکہ لوگوں کو دنیا کے اچانک ختم ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے ...... بہت سے عیسائیوں نے اپنی زمینیں اور مال واسباب بیچ کر فلسطین کا رخ کیا تا کہ جب دنیا کا خاتمہ ہو تو وہ ارض مقدس میں مقیم ہوں۔ لیکن دنیا کا خاتمہ نہیں ہوا اور وہ ہزاروں عیسائی جو یروشلم چلے گئے تھے وہاں ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا، وہ لوگ غصہ میں بھرے ہوئے اپنے گھروں کو واپس آئے اور ارض مقدس میں ان کے ساتھ جو حقارت آمیز سلوک روا رکھا گیا تھا اس کی روداد اپنے ہم وطنوں کو سنائی۔ ایک راہب زائر پیٹر ہرمٹ ہاتھ میں عصا لئے بستی بستی گھومتا اور لوگوں کو اکساتا کہ وہ ارض مقدس کو مسلمانوں کے قبضہ سے آزاد کرائیں۔ کرسچن ڈم (یوروپ) میں عوامی اشتعال دیکھ کر پوپ نے اس مہم کی قیادت سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۰۹۵ء میں کلیسائی کونسل نے یروشلم کو مسلمانوں کے قبضے سے آزاد کرانے کے لئے کروسیڈ (صلیبی جنگ) کا اعلان کیا، اس طرح کروسیڈ یعنی کرسچن ڈم کی اسلام سے جنگ شروع ہوئی یا یوں کہو کہ صلیب اور ہلال کے معرکہ کا آغاز ہوا۔ (ص ۷۹-۱۷۸)

آگے لکھتے ہیں: ''بالآخر صلیبی مجاہدین ایک نارمن سردار گاڈفرے کی قیادت میں فلسطین پہنچ گئے۔ یروشلم پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد ایک ہفتہ تک قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ یہ ایک لرزہ خیز قتل عام تھا۔ ایک فرانسیسی عینی شاہد کا بیان ہے کہ مسجد (اقصیٰ) کی ڈیوڑھی میں گھٹنوں گھٹنوں انسانی خون تھا یہاں تک کہ گھوڑوں کی لگامیں خون میں ڈوب رہی تھیں۔ پھر گاڈفرے یروشلم کا بادشاہ بن گیا (ص ۱۸۵)

اس طرح ۱۰۹۵ء میں صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ تک عیسائیت اور اسلام کے درمیان معرکہ آرائی جاری رہی صلیب و ہلال ایک دوسرے کے مقابل صف آرا رہے...... اس طویل خونریزی سے صلیبی مجاہدین کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا سوائے اس کے کہ لاکھوں عیسائی اور مسلمان خاک و خون میں تڑپ کر ختم ہوگئے اور ہزارہا آلام و مصائب میں گرفتار ہوئے۔ ایشیائے کوچک اور فلسطین ایک بار پھر انسانی خون میں ڈوب گئے۔ (ص ۱۸۳)

صلیبی جنگوں میں ناکامی کے بعد پیران کلیسا نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ذہنی یلغار کا آغاز کیا۔ کلیسا کے تربیت یافتہ افراد نے استشراق (Orientalism) کے پرکشش نام سے اسلام قرآن اور پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والتسلیم کے خلاف اپنے قلم کو تیغ برہنہ کی طرح استعمال کرنا شروع کیا۔ ریسرچ (تحقیق) کے نام پر اسلامی عقائد قرآنی تعلیمات اور سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تجزیہ کیا جانے لگا کیونکہ مقصد تحقیق نہیں تنقیص تھا۔ اس لئے منفی انداز فکر اور معاندانہ تحریروں کو تحقیقی نتائج کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہ تحقیق اور اس کے نتائج کچھ اس انداز کے تھے'' محمد امی (ان پڑھ) نہیں تھے یہ عقیدہ اس لئے اختراع کیا گیا تاکہ قرآن کو معجزہ ثابت کیا جاسکے۔ محمد ایک ذہین اور فاضل شخصیت تھے اپنے

تجارتی اسفار کے دوران وہ عیسائی اور یہودی علماء سے گفتگو کرتے تھے۔ ان کے مذہب اور مذہبی صحیفوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے۔ خدیجہ سے شادی کے بعد وہ ان کے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل سے ربط رکھتے تھے۔ خدیجہ نے انہیں ایک غلام زید بن حارثہ دیا تھا جو پہلے عیسائیوں کا غلام رہ چکا تھا۔ محمد اس سے عیسائی مذہب اور شعائر کے بارے میں پوچھتے تھے۔ ان تمام باتوں نے ان کے ذہن کو آمادہ کیا کہ وہ خود اپنا الگ دین وضع کریں۔ یہودیوں سے حاصل کی گئی معلومات کو انہوں نے اپنے دین کی اساس بنایا۔ قرآن میں وہی کچھ ہے جو تورات میں کہا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے دین کا نام بھی عبرانی لفظ ''شولوم'' سے اخذ کیا اور اسلام کا وجود عمل میں آیا۔ محمد کو مرگی جیسے دورے پڑتے تھے اور اس حالت میں وہ جو کچھ کہتے تھے اسے انہوں نے وحی کا نام دیا اور قرآن کی شکل میں اسے مدون کیا۔ محمد کے اقوال میں تضاد پایا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ (عربی اسلامی علوم اور مستشرقین۔ ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی)

دراصل ابتدائی مستشرقین دور ہائے جدید میں وہ مسیحی مبلغین تھے جنہوں نے عالم اسلام میں مشنری سرگرمیوں کو فروغ دیا۔ اسلام کی تعلیمات اور تاریخ کی شکل کو انہوں نے جس طرح بگاڑا تھا اس کا مقصد ہی یہی تھا کہ بت پرستوں (مسلمانوں) کے سلسلے میں اہل یوروپ کے نقطۂ نظر پر اثر ڈالا جائے۔ استشراق اگرچہ بعد کو مشنری نفوذ سے آزاد ہو گیا البتہ روایتی عقلی انحراف باقی رہا۔ اب مستشرقین کے پاس ایسا کوئی عذر نہیں ہے جس سے اب تک مذہبی تعصب کے باقی رہنے کی وجہ معلوم ہو سکے۔ اسلام پر مستشرقین کی یورش ایک موروثی عادت بن چکی ہے جس کی بنیادیں صلیبی جنگوں اور ان کے مضمرات نے فراہم کی ہیں۔ ایک اور مستشرق بیکر لکھتا ہے ''مسیحیت کو اسلام سے دشمنی اس لئے ہے کہ عہد وسطیٰ میں اسلام کی

اشاعت نے مسیحیت کی راہ سختی سے روک دی تھی اور اسلام ان علاقوں میں پھیل گیا جہاں پہلے مسیحیت کا اثر ونفوذ تھا۔ (ڈاکٹر عماد الدین خلیل۔عربی اسلامی علوم اور مستشرقین ص ۵۲)

جناب سہل انجم نے اپنی گرانقدر تصنیف ''مغربی میڈیا اور اسلام'' میں (جس کے لئے حسب الحکم یہ سطور قلم بند کی جارہی ہیں) معروف فلسطینی اسکالر ڈاکٹر ایڈورڈ سعید کا یہ قول نقل کیا ہے کہ'' یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ مغرب ہی ہمیشہ اسلام سے نبرد آزما رہا ہے نہ کہ عیسائیت''معزز فلسطینی اسکالر (جو اب وفات پا چکے ہیں) کے اس قول کی تاریخی شواہد سے تائید نہیں ہوتی۔ اول تو مغرب اور عیسائیت میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔مغرب کو کرسچن ڈم (سرزمین مسیحیت) کہا جاتا ہے۔ترکی، بوسنیا، البانیہ اور کوسووو جیسے چند ممالک کو چھوڑ کر جو تہذیبی اعتبار سے مغربی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، یوروپ کی غالب آبادی عیسائی ہے وہاں سیاست اور اقتدار میں بھی مسیحیت کا غلبہ رہتا ہے۔ برطانیہ کا تاجدار حامی دین (مسیح) Defender of the Faith کہلاتا ہے اور چرچ آف انگلینڈ کا سربراہ ہوتا ہے۔ امریکہ میں عہدۂ صدارت کا حلف لینے والا اس دوسو سال پرانی انجیل کے نسخہ پر ہاتھ رکھ کر حلف لیتا ہے جس پر امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن نے ہاتھ رکھ کر حلف لیا تھا۔مغرب میں مذہب بیزاری کے باوجود کلیسا کا اقتدار اب بھی بڑی حد تک برقرار ہے۔ویٹی کن میں پوپ آج بھی اسلام سے مصالحت پر آمادہ نہیں ہے۔سابق پوپ جان پال دوئم جب یروشلم گئے تو انہوں نے دیوار گریہ (جو ہیکل سلیمان کی نشانی سمجھی جاتی ہے) کے شگاف میں ایک تحریری معافی نامہ رکھا جس میں یہودیوں سے ان مظالم پر معافی مانگی گئی تھی جو عہد وسطیٰ میں کیتھولک کلیسا نے ان کے اجداد پر روا رکھے تھے۔لیکن پوپ جان پال دوئم نے یروشلم کے عرب

مسلمانوں سے معافی مانگنے یا معذرت کا ایک لفظ کہنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی جنہیں صلیبی مجاہدوں نے یروشلم پر قبضہ کر کے شہید کیا تھا اور بقول فرانسیسی عینی شاہد مسجد (اقصیٰ) کے دروازے پر اتنا زیادہ انسانی خون تھا کہ صلیبی سپاہیوں کے گھوڑوں کی لگامیں خون میں ڈوب رہی تھیں۔ نہ انہوں نے اسپین میں عرب مسلمانوں کے قتل عام پر اظہار ندامت کیا جس کے بارے میں سید امیر علی نے لکھا ہے کہ عیسائیوں نے اندلسی مسلمانوں پر جیسے لرزہ خیز مظالم کئے ہیں انہیں معاف کرنے یا بھول جانے کے لئے عیسیٰ اور محمد دونوں کے مجموعی جذبہ عفوودرگزر سے کام لینے کی ضرورت پیش آئے گی۔ موجودہ پوپ بنڈکٹ شش دہم بھی پیران کلیسا کے اسی شجر زقوم کی ایک شاخ ہیں جو اسلام پر زہریلی ہوا کے جھونکوں کی یلغار کرتے رہتے ہیں۔ وہ ترکی کے یوروپین یونین میں شامل کئے جانے پر اس لئے رضامند نہیں ہیں کہ ترکی ایک مسلم اکثریت کا ملک ہے جبکہ یوروپین یونین ایک صلیبی برادری ہے۔ انہوں نے اسلام کے بارے میں جن معاندانہ خیالات کا اظہار کیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ کیتھولک کلیسا آج بھی صلیبی جنگوں کے عہد میں جی رہا ہے۔ پوپ بنڈکٹ کو عہد وسطیٰ کے ایک مجہول لبنانی مسیحی کا اسلام کے بارے میں غیر معقول جملہ تو یاد رہا لیکن قرآن مجید میں عیسائیوں کے بارے میں نازل شدہ اس آیت پر غور نہیں کیا" ولتجدن اقربهم مودة للذين آمنوا الذين قالوا انا نصاری. ذلک بان منهم قسيسين ورهبانا وانهم لا يستكبرون ۝ واذا سمعوا ماانزل الى الرسول ترىٰ اعينهم تفيض من الدمع مماعرفوا من الحق يقولون ربنا آمنا فاكتبنا مع الشهدين ۝ (المائدہ ۸۲-۸۳)

اور ایمان والوں سے سب سے زیادہ دوستی کے قریب یقیناً آپ انہیں پائیں گے جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں اس لئے کہ ان میں دانش مند اور گوشہ

نشین ہیں اور وہ لوگ تکبر نہیں کرتے۔ اور جب وہ رسول کی طرف نازل کردہ کلام کو سنتے ہیں تو آپ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر دیکھتے ہیں کیونکہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے تو ہمیں ان لوگوں میں لکھ لے جو تصدیق کرنے والے ہیں۔

جو لوگ قرآن میں دیگر مذاہب کے پیروان کی بابت سخت اور قابل اعتراض لہجے پر انگشت نمائی کرتے ہیں کیا انہوں نے یہ آیت کریمہ پڑھی ہے۔ عبرت کی بات یہ ہے کہ صدر اسلام میں جیسے دانش منداور دین فہم عیسائی تھے، کلیسا کی معاندانہ روش کے سبب ایسے برگزیدہ اصحاب کو فروغ حاصل نہیں ہو سکا۔ حق پرستی کے بجائے کلیسا نے حق دشمنی کو اپنی شناخت اور شعار بنالیا۔ آج مغرب میں اسلام کے بارے میں جو غیر ہمدردانہ اور جارحانہ جذبات پائے جاتے ہیں اس کے پیچھے کلیسا کی سازشیں کارفرما ہیں۔ آج موجودہ عالمی تناظر میں اہل مغرب اسلام اور قرآن فہمی کی طرف مائل ہیں لیکن پوپ بنڈکٹ اسلام کے خلاف بیان بازی کرکے اس جذبہ کو ابھرنے نہیں دینا چاہتے۔ یعنی حقیقی صورت حال یہ ہے کہ مغرب اسلام سے نبرد آزما ہونا نہیں چاہتا لیکن عیسائیت (کلیسا) اسے مصالحت کی اجازت دینے کو تیار نہیں ہے۔ قرآن نے عیسائیوں اور یہودیوں کو کافر نہیں کہا بلکہ اہل کتاب People of the Book کہہ کر اہل ایمان کے زمرہ میں شامل کیا۔ ان کے رسولوں اور صحیفوں کی صداقت کا اعتراف کیا۔ اس کے ساتھ ان میں کی گئی تحریف کی نشان دہی بھی کی اور اصلاح کی دعوت بھی دی لیکن دونوں نے قرآن کی دعوت سے اعراض کیا اور اپنے اپنے فاسد عقائد پر قائم رہے۔ کلیسا نے اہل کتاب کی جگہ اہل عہد نامہ People of the Testament کی اصطلاح وضع کرکے عیسائیوں اور یہودیوں کا اتحاد قائم کرلیا اور اہل کتاب کی اصطلاح ترک کردی کیونکہ اس میں

مسلمان بھی شامل ہوتے ہیں۔ مضمر طور پر اس کا مطلب یہ کہ کلیسا قرآن مجید کے صحیفہ سماوی ہونے کا قائل نہیں وہ صرف عہد نامہ قدیم (توراۃ) اور عہد نامہ جدید (انجیل) کو ہی مانتا ہے اور اسی لئے اپنے عہد نامہ کے اتحاد کا داعی ہے، مسلمان اس کے اتحاد میں کوئی جگہ نہیں پا سکتے۔ جبکہ قرآن واضح طور پر اور تکرار کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت وہی تھی جو ابراہیم موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کی تھی اور قرآن مجید وہی کہتا ہے جس کی وحی موسیٰ اور عیسیٰ کی طرف بلکہ تمام انبیاء سابق کی طرف کی گئی'' وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون ۝ (الانبیا۔۲۵) (اے محمد) تم سے پہلے بھی جو رسول ہم نے بھیجا اسے یہی وحی کی گئی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس تم میری ہی عبادت کرو۔ یہ وحی یہ تعلیم اور تلقین توحید خالص کی ہے اس میں نہ باپ بیٹے اور روح القدس کی تثلیث کا ذکر ہے، نہ کسی کے ابن اللہ ہونے کا، نہ خیر وشر کو یزدان واہرمن کے درمیان تقسیم کرنے کا۔ اللہ ایک ہے مالک ومختار ہے، نہ اس کے کوئی بیٹا ہے، نہ وہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔ معلوم نہیں اس سیدھی سچی تعلیم میں وہ کیا چیز ہے جس سے پیران کلیسا خوف زدہ ہیں۔ قرآن مجید جب انہیں ان فاسد عقائد کو چھوڑ کر توحید کی طرف رجعت کی دعوت دیتا ہے اور ان کے ربیوں، اسقفوں کی کج روی اور ہٹ دھرمی پر تنقید کرتا ہے تو الزام لگایا جاتا ہے کہ قرآن میں دوسرے مذہب والوں پر تنقید کی گئی ہے۔

ھننگٹن کی تھیوری تہذیبوں کے تصادم پر عالمی طور پر خاصی بحث ہو چکی ہے۔ کچھ افراد اس سے انکار کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مغرب یا عیسائیت کا حریف صرف اسلام اور اس کے عقائد وشعائر ہیں۔ اشتراکیت کے انتشار کے بعد اب سرمایہ دار مغرب کو عالمی چوکیدار بننے کی راہ میں اسلام ہی مزاحم

ہے کیونکہ اسلام کی تعلیمات عقلی استدلال کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں جبکہ کلیسا جو کچھ سکھاتا اور پڑھاتا ہے اس سے خود مسیحی اسکالرز بھی مطمئن نہیں ہیں۔ یہ تو اس بات کا اعتراف ہے کہ اسلام کے ہوتے ہوئے اس کی بیشتر سرگرمیاں کامیاب نہیں ہو پاتیں۔ اس کے مبلغ اسلام کے اعتراضات کا مسکت جواب نہیں دے سکتے۔ اس لئے کلیسا آج بھی اسلام کو اپنا حریف سمجھتا ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کے نظریہ کے پیچھے اصل جذبہ یہ ہے اسلام اور اس کی پاکیزہ تہذیب کو کلیسا کی راہ سے ہٹا دیا جائے تاکہ مغرب اشتراکیت کی طرح اسلام کو بھی پس منظر میں ڈھکیل دے۔ تہذیبوں کے تصادم کے پردہ میں اسلام اور کلیسا کے تصادم کو ایک نئے نام اور عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ کہنا کہ تہذیبیں متصادم نہیں ہوتیں پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ ہر غالب تہذیب مغلوب تہذیب کو مسخ کرتی ہے اور رفتہ رفتہ اسے بے اثر کردیتی ہے۔ تہذیبوں کا یہ تصادم اسلحہ کے ذریعہ نہیں ہوتا غیر شعوری طور پر غالب تہذیب مغلوب تہذیبوں کو نگلتی رہتی ہے۔ ہندوستان میں مسلم تہذیب جو انڈو مغل ارتباط کے طور پر ابھری اسے انگریزی تہذیب نے پسپا کردیا۔ اب آزادی کے ساٹھ سال بعد انگریزی تہذیب کو ہندو تہذیب کے چیلنج کا سامنا ہے چونکہ مغربی تہذیب اپنی عریانی فحاشی اور بے لگام آزادی کے سبب ناپختہ اور جرائم پیشہ ذہنوں کے لئے کشش رکھتی ہے اس لئے اس کی یہ پسپائی تیزی سے عمل میں نہیں آئے گی۔ مغرب میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سلمان رشدی ہو، تسلیمہ نسرین ہو، ڈنمارک کا کارٹونسٹ ہو یا ہالی ووڈ کے فلم ساز یا قرآن مخالف فلم یہ سب درحقیقت کلیسا کے خفیہ ایجنڈے کو بروئے کار لانے میں مصروف ہیں۔ ادب اور آرٹ کے پردہ میں اسلام دشمنی کا یہ عمل صدیوں سے جاری ہے۔ دانتے DANTE عہد وسطی کا مشہور اطالوی شاعر تھا اس نے طربیہ خداوندی Divine Comedy کے نام سے ایک

طویل تمثیل منظوم کی۔ سیر سماوی کے منظر نامے میں اس متعصب صلیبی شاعر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوزخ کے طبقہ اسفل میں دکھایا ہے۔ ایک مصور نے اس منظر کو ایک مرقع دیوار (Mural) کے طور پر بلونا کے کلیسا میں نقش کیا۔ آج بھی یہ اذیت ناک مرقع کلیسا کی دیوار پر موجود ہے اور صلیبیوں کی پست فطرتی کی چغلی کھا رہا ہے۔ مغربی میڈیا پروپیگنڈا کر رہا ہے کہ مسلم دہشت گرد بلونا کے چرچ کو بم سے اڑا دینگے کیونکہ اس کی دیوار پر پیغمبر کی قابل اعتراض تصویر ہے لیکن یہ میڈیا اس بات کو اجاگر نہیں کرتا کہ کلیسا کو اس نقش بہ دیوار مرقع کو مٹا دینا چاہئے۔ مسلمانوں نے کبھی مسیح و مریم علیہا السلام کی شان میں گستاخی نہیں کی کیونکہ قرآن ان کی عظمت و صداقت کا اعلان کرتا ہے۔ مسلمانوں نے کبھی سینٹ پال، سینٹ زیویر وغیرہ کو بھی نشانہ نہیں بنایا حالانکہ سب جانتے ہیں کہ مسیح کی صحیح اور سچی تعلیم کو مسخ کرنے اور تثلیث کا عقیدہ رائج کرنے میں پال کا بنیادی کردار رہا ہے۔ آج عیسائیت کو بعض اسکالرز کرسچینٹی کے بجائے پال ازم سے تعبیر کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی اس رواداری کا مغرب نے مثبت جواب نہیں دیا بلکہ اس کی دلآزاری کے جذبہ کو بنڈکٹ کے اسلام دشمن تبصروں سے اور تحریک ملتی ہے۔

ایک مسئلہ عورتوں کا ہے مغرب کا کہنا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو قیدی بنا دیا ہے۔ سر ڈھکنا، پردہ کرنا، گھر میں بند رہنا مغرب کو بڑا عجیب لگتا ہے اس کے نزدیک عورت کو اشتہار بازاری، عریاں اور نیم عریاں نمائش کلب، بار، نائٹ کلب میں عریاں رقص کے ذریعہ آزادی کا سرٹیفکٹ دیا جا سکتا ہے۔ تقریبا ایک دہائی قبل شہزادہ چارلس ولی عہد برطانیہ نے آکسفورڈ اسلامک سنٹر میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسلام نے چودہ سو سال پہلے عورت کو جو حقوق عطا کئے تھے وہ یوروپ میں اب سے سو سال پہلے تک میری دادی کو بھی حاصل نہیں تھے۔

اس تاریخ اور وقائع کے تناظر میں سہیل انجم کی کتاب ''مغربی میڈیا اور اسلام'' ایک ہمہ جہتی مطالعہ پیش کرتی ہے۔ میڈیا آج کے دور میں سب سے طاقتور ہتھیار بن چکا ہے۔ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ لوگوں کے آنکھ، کان، ذہن و دل کو مسحور کر لیتا ہے۔ آج بیشتر لوگ وہی سنتے ہیں جو میڈیا انہیں سناتا ہے اور اسی پر یقین کرتے ہیں جو میڈیا انہیں بتاتا ہے۔ چونکہ میڈیا غیر جانبدار نہیں ہے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر کلیسائی ایجنڈے کو بروئے کار لانے میں مصروف ہے اس لئے اسلام اور مسلمان اس کا اولیں ہدف ہوئے ہیں 9/11 کے بعد اس کے خونی پنجے اور دانت مسلمانوں کے لہو سے اور بھی زیادہ رنگین ہو گئے ہیں اور انہیں سیاسی اور سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ لہٰذا ان کی سفاکی ہزار چند ہوگئی ہے۔ سہیل انجم نے متفرق عناوین کے تحت مغربی میڈیا کے ان تمام پہلوؤں کا اجمال اور تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور اپنی بات کو دستاویزی ثبوت اور اعداد و شمار کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ سہیل انجم کا مطالعہ وسیع، مشاہدہ عمیق اور تنقیدی و تجزیاتی شعور پختہ ہے اس لئے وہ اپنی بات پورے وثوق اور اعتماد سے پیش کرتے ہیں۔ ان کا تعلق چونکہ نیشنل اور انٹر نیشنل میڈیا سے ہے اور وہ اس جدید میکانزم کا ایک حصہ ہیں اس لئے وہ جانتے ہیں کہ کون سا پرزہ کہاں غلط فٹ کیا گیا ہے اور کون سا کہاں غلط کام کر رہا ہے اس لئے وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں معتبر بھی ہوتا ہے اور مستند بھی۔

سہیل انجم نے صحافت کو پروفیشن کے ساتھ مشن بھی بنایا ہے اس لئے وہ اسے غلط عناصر سے پاک کرنے اور صالح عناصر کے فروغ کے لئے جدوجہد کرنے میں سرگرم کار رہتے ہیں۔ اس سے قبل ان کی ایک کتاب ''میڈیا روپ اور بہروپ'' شائع ہو چکی ہے جو اپنے موضوع پر بہت معتبر کتاب ہے۔ یہ کتاب گویا نقش ثانی ہے اور ''نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول'' کے مصداق اپنے موضوع پر پہلی کتاب

سے زیادہ مبسوط ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اردو میں اس موضوع پر عام طور پر بہت کم لکھا گیا ہے جو کچھ لکھا بھی گیا ہے وہ انہوں نے لکھا جو میڈیا کے رازہائے درونِ پردہ سے پوری واقفیت نہیں رکھتے یہ کتاب ایک ایسے صحافی کے قلم سے نکلی ہے جو مدت سے اس کان نمک میں موجود ہے لیکن اس نے خود کو نمک نہیں بننے دیا، اس نے بازاری صحافت کو اپنا پیشہ نہیں بنایا بلکہ صالح اور تعمیری صحافت کو اپنا مطمح نظر مانا۔ سہیل انجم صحافت میں مصلحت کے قائل نہیں حقیقت پسندی کے قائل ہیں۔ حق پرستی انسان کو بیباک بناتی ہے۔ سہیل انجم کے ہاں یہ بیبا کی ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ قلم سے پردہ دری کا کام بھی لیتے ہیں اور بخیہ گری کا بھی۔ وہ ان عناصر کی پردہ دری کرتے ہیں جنہوں نے صحافت کو پست سطح پر گرادیا ہے اسی کے ساتھ وہ ان دیانت دار انصاف پسند جری اور حق بات کہنے کا حوصلہ رکھنے والے ان صحافیوں کا تعارف کراتے ہیں اور ان کی خدمات کو اجاگر کرتے ہیں جو اس پرآشوب دور میں بھی مظلوموں کے حق میں بیبا کی سے آواز اٹھاتے ہیں اور میڈیا کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سہیل انجم نے مسلمانوں کے خلاف میڈیا کے رول پر بھی کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔

عصری تناظر میں ملک کا ماحول یہ ہے کہ جس مسلمان کو چاہو دہشت گردی کے نام پر پکڑ کر جیل میں ڈال دو۔ بارکونسل فیض آباد نے ایک فیصلہ کے تحت اعلان کیا ہے کہ وہ دہشت گردوں کے مقدمات کی نہ پیروی کریں گے نہ کسی اور کو کرنے دیں گے۔ اسے کہتے ہیں زبردست مارے اور رونے بھی نہ دے۔ وکلا دہشت گردوں کے مقدمات کی پیروی نہیں کریں گے، یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن دوسروں کو بھی نہیں کرنے دیں گے یہ کھلی ہوئی فسطائیت ہے۔ ہندوستانی میڈیا دہشت گردی کے نام پر پکڑے گئے مسلم نوجوانوں کی تو تشہیر کرتا ہے اور وہ سب کچھ

نمایاں طور پر شائع کرتا ہے جو پولس یا سیکورٹی ایجنسیاں اسے بتاتی ہیں لیکن وکیلوں کی اس فسطائی ذہنیت کے بارے میں وہ خاموش رہتا ہے۔ بدقسمتی سے پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا دونوں میں ایسے افراد خاصی تعداد میں موجود ہیں جو ایسی ذہنی تربیت لے کر آتے ہیں اور ایک مخصوص فرقے کے بارے میں ان کی فکر ہمیشہ منفی رہتی ہے۔

سہیل انجم نے اپنی اس کتاب میں تاریک منظرنامہ کے ساتھ امید کی روشنی بھی دکھائی ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ 9/11 کے بعد امریکہ میں اسلام اور قرآن کے بارے میں تجسس بڑھا ہے، لوگ اسلام اور قرآن کو صحیح تناظر میں سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے ایک مصری عالم شیخ ولید کا قول نقل کیا ہے کہ 9/11 کے بعد وہ اس اندیشہ کا شکار تھے کہ اسلام کی تبلیغ میں انہوں نے جو محنت کی تھی وہ سب رائیگاں ہو جائے گی لیکن انہیں حیرت ہوئی جب انہیں بہت سی انجمنوں کی جانب سے اسلام پر لیکچر دینے کے دعوت نامے موصول ہوئے۔ 9/11 کے بعد امریکہ میں اسلام ایک نئے وسیع اور روشن دور میں داخل ہو رہا ہے اس کی تبلیغ تفہیم اور تعارف کی نئی جہتیں سامنے آئی ہیں۔

سہیل انجم کی یہ کتاب اس لئے بھی قابل قدر ہے کہ یہ ہمیں ان حقائق سے آگاہ کرتی ہے جن کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی مستند نہیں ہیں افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ سہیل انجم اور ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر شمس کمال انجم استاذ شعبہ عربی (بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری، جموں وکشمیر) کو قلم ورثے میں ملا ہے۔ ان کے والد ماجد مولانا حامد الانصاری انجم حفظہ اللہ جید عالم، قادر الکلام شاعر، سحر بیان خطیب اور دینی تدریس وتبلیغ کے مرد میدان ہیں۔

ان کی ساری عمر اسی گلزار کی چمن بندی میں گزری، ہے آج ان کی سعی و کاوش کے طفیل اس علاقے میں دینی مدارس قائم ہیں طلبہ اور علماء سرگرم کار ہیں۔ مولانا حامد الانصاری انجم حفظہ اللہ نے جو باغ لگایا تھا وہ ثمر آور ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ان کے لئے صدقہ جاریہ بنائے اور ہماری نئی نسلیں ان کی زندگی سے ترغیب اور فیضان حاصل کریں۔

سہیل انجم صحافت کے ساتھ ادب کا بھی ستھرا مذاق رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب بازیافت ان کی تنقیدی بصیرت کو ظاہر کرتی ہے۔ ہمارے ہاں ابوالکلام آزاد، ثناء اللہ امرتسری، غلام رسول مہر، محمد اسحٰق بھٹی جیسے عظیم صحافی ہیں جنہوں نے ادب، دین اور صحافت کے امتزاج سے نئی روایتیں قائم کی ہیں۔ سہیل انجم اور شمس کمال انجم دونوں اسی زمرہ کے ابھرتے ہوئے اہل قلم ہیں کیونکہ قلم کاری انہیں ورثہ میں ملی ہے اس لئے وہ ارتقاء کی منزلیں تیز رفتاری سے طے کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وہ ادب اور صحافت کی راہ میں مزید نئی اور روشن روایات قائم کریں گے۔ انشاءاللہ۔

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

ڈاکٹر رضوان احمد

فی زمانہ میڈیا ضروریات زندگی میں شامل ہو کر روزمرہ کی مصروفیات کا حصہ بن گیا ہے۔ہم چاہیں یا نہ چاہیں یہ ہماری زندگی میں دخیل ہے۔اس لئے چاہ کر بھی میڈیا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔جو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپانے کی سعی ناکام کرتے ہیں جو ہمارے لئے نقصان کا سودا ہے۔حالات کا تقاضہ ہے کہ حقائق سے نظریں چار کی جائیں اور ان کا سامنا کرنے کی عادت ڈالی جائے۔خواہ یہ حالات کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں۔وقت کے ساتھ حالات بدلتے ہیں۔یہی صورتحال میڈیا کے ساتھ بھی ہے۔بلاشبہ میڈیا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برہنہ اشتعال انگیزی کر رہا ہے۔حقائق کو مسخ کر کے پیش کرنے میں اسے ید طولی حاصل ہے۔مگر ہم اس کے مقابلے میں کب تک خاموش رہیں گے۔ہمیں جواب دینا چاہئے خواہ ہماری آواز کمزور ہی کیوں نہ ہو۔یہی کمزور آواز کل توانا بھی ہو سکتی ہے۔

اردو والوں کی دشواری یہ ہے کہ یہاں معروضی انداز میں تجزیہ کر کے اپنی باتیں پیش کرنے کی روایت معدوم ہے۔ہم لفاظی سے زیادہ کام لیتے ہیں۔مگر آج کا میڈیا اس سے پرے ہے جہاں صرف لفاظی سے کام نہیں چلتا۔کیونکہ اب میڈیا یک رخی نہیں رہ گیا ہے،اس کی متعدد اقسام ہیں۔ چھ سو سال قدیم پرنٹ میڈیا آج بھی میدان میں ہے اور بلاشبہ یہ آج بھی سب سے طاقتور ہے۔لیکن الیکٹرانک میڈیا اور انٹرنیٹ نے اپنی جگہ بنالی ہے اور روز بہ روز ان کی اہمیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

گذشتہ چند برسوں میں اردو زبان میں میڈیا کے موضوع پر کئی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس شعبے میں جو نام ابھر کر سامنے آئے ہیں ان میں باصلاحیت نوجوان صحافی سہیل انجم کا نام نمایاں ہے۔ ''مغربی میڈیا اور اسلام'' سے قبل ان کی پر از معلومات کتاب ''میڈیا روپ اور بہروپ'' منظر عام پر آ چکی ہے جس کو صحافتی حلقوں میں خوب سراہا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب ''مغربی میڈیا اور اسلام'' بہت ہی حساس لیکن جلتے اور سلگتے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ 11 ستمبر 2001 نہ صرف دنیا کی تاریخ کے لئے ایک اہم دن ہے کہ اس واقعہ نے عالم کی تاریخ اور جغرافیہ کو تبدیل کر دیا بلکہ اس نے میڈیا کا رخ بھی تبدیل کر دیا، اس کی سمت بدل دی۔ اس دن کے بعد سے میڈیا کی توپوں کے دہانوں کا رخ اسلام اور مسلمانوں کی جانب پھیر دیا گیا۔

ان سات برسوں میں دنیا زیروزبر ہوتی رہی ہے۔ عالم اسلام کو کن حالات سے گزرنا پڑا وہ تاریخ کا مکروہ باب ہے۔ لیکن اس میں میڈیا کا کیا تعمیری یا تخریبی کردار رہا ہے اس کا معروضی جائزہ لینے کی ضرورت تھی اور بڑی حد تک سہیل انجم نے اس تقاضے کو پورا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق میں کافی عرق ریزی اور دقت نظر سے کام لیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریر میں کہیں بھی جذباتیت کو راہ نہیں دی۔ اپنی معروضات پیش کی ہیں تو اس میں بھی ان کا لہجہ خالص رجائی ہے۔

میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ یہ بے حد حساس موضوع ہے کیونکہ مغربی میڈیا ایک طرح سے مسلمانوں کے تئیں نفرت کے جذبات سے لبریز ہے اور اسلام کے تئیں بے حد حقارت آمیز لب ولہجہ اختیار کرتا ہے۔ سہیل انجم نے انتہائی محنت سے سارا مواد جمع کر کے اس کا تجزیہ کیا ہے۔ جہاں ماحول اس قدر زہر آلود ہو وہاں بھی مصنف نے امید کا دامن نہیں چھوڑا اور روشنی کی کرنیں تلاش کر لی ہیں۔ گھنگھور اندھیارے

میں مدھم کرن کی بھی اہمیت ہوتی ہے کیونکہ صبح فردا کی نمو اسی سے ہوتی ہے۔

11 ستمبر 2001 کے بعد امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں مسلمان کس طرح کشتہ الم بنتے رہے وہ تاریخ کا ایک تاریک باب ہے مگر ان سختیوں کے بعد امریکہ کے عوام اسلام کی جانب راغب ہوئے۔ انھوں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ان کا میڈیا جس اسلام کو پے بہ پے ہدف بنا رہا ہے وہ دراصل کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کے بعد ان میں اسلام کے بارے میں جاننے کی پیاس رونما ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب وہاں اسلام کے لئے راہ ہموار ہونی شروع ہوئی ہے۔ حالانکہ مغربی میڈیا کا اسلام اور مسلمانوں کے تئیں معاندانہ رویہ ابھی زیادہ تبدیل نہیں ہوا ہے، ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کے لئے وقت درکار ہے۔

سہیل انجم نے تمام موضوعات کا شرح وبسط سے جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اپنے استدلال کو مضبوط بنانے کے لئے اعداد و شمار کا بھی سہارا لیا ہے۔ سروے کرنے والی معتبر ایجنسیاں جو اعداد و شمار جمع کرتی ہیں ان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور یہ اعداد و شمار عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انھوں نے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔

مغربی میڈیا ایک عفریت کے مماثل ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کا مقابلہ ہم کس طرح کر سکتے ہیں یہ سوال سہیل انجم نے بار بار اٹھایا ہے اور بجا طور پر اٹھایا ہے مگر مقابلہ تو اسی سے کیا جاتا ہے جو سینہ سپر ہو کر سامنے سے وار کرے۔ مغربی میڈیا کا سب سے مکروہ حربہ ڈس انفارمیشن موومنٹ (Disinformation Movement) ہے اور یہ ایسا حربہ ہے جس کی کاٹ اب تک نہیں کی جا سکی ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کی تمام توانائی اسی بات پر صرف ہو رہی ہے کہ حقائق تک عوام کی رسائی نہ ہو سکے۔ اس میں وہ بہت حد تک کامیاب ہیں کیوں کہ ان کے ذرائع ابلاغ ذہن کو زہر آلود کر کے مسموم بنا

رہے ہیں۔ یہ دنیا کے سامنے بہت بڑا چیلینج ہے اور آنے والے دور میں اس کا جواب میڈیا کو دینا پڑے گا۔ پرامن انسانوں کو دہشت گرد بنا کے پیش کرنا، جھوٹے اور بے بنیاد الزامات لگا کر نہ صرف حکومتوں کو زیروزبر کردینا بلکہ انسانی بستیوں کو تاراج کردینا' دوسروں کے وسائل پر بزورطاقت قابض ہو جانا اور بنی نوع انسان کو تباہ و برباد کردینا اور سب سے بڑھ کر میڈیا کا ان چیرہ دست اور تخریب پسند طاقتوں کی ہمنوائی کرنا' اسے وقت کا جبر ہی کہا جاسکتا ہے اور وقت کا جبر بے حد المناک ہوتا ہے۔ مگر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جب عوام کو حقائق کا پتہ چل جائے گا تو وہ ان مکروہ چہروں سے نقاب اتار پھینکیں گے۔ وقتی طور پر چرب زبانی سے عوام کو گمراہ کیا جاسکتا ہے مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ جوش کے تیز دھارے میں بہہ کر عوام بہت کچھ کر گزرتے ہیں مگر جب انہیں ہوش آتا ہے تو تخریب کی تشہیر کرنے والے کا انجام المناک ہوتا ہے۔

ابھی تو مغربی میڈیا کی چیرہ دستیاں جاری ہیں۔ سہیل انجم نے بروقت اس موضوع پر اتنی اہم کتاب لکھی ہے اور بلاشبہ اردو میں اس موضوع پر لکھی جانے والی یہ پہلی کتاب ہے۔ ان کا انداز تحریر بھی دل کش ہے جس کی یکسانیت شروع سے آخر تک جاری رہتی ہے۔ اس لئے ایسے خشک موضوع پر کتاب پڑھتے وقت اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔

مغربی یا مشرقی میڈیا کا موازنہ مقصود نہیں ہے۔ ایسا کرنا بھی بے سود ہے کیوں کہ ہمارے یہاں پریس کی روایت صرف سو دو سو سال قدیم ہے جبکہ مغرب میں یہ چھ سو سال قدیم ہے۔ ہمارے یہاں کا قومی میڈیا بھی اس تخریب کاری سے آشنا ہو چکا ہے جو مغربی میڈیا کا وطیرہ بن گیا ہے۔ سہیل انجم نے اس موضوع پر بھی خامہ فرسائی کی ہے اور مغرب کو آئینہ دکھایا ہے۔

سہیل انجم اس کاوش کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یقیناً اس کا اردو کے صحافتی حلقوں میں پرجوش خیر مقدم ہوگا۔

میڈیا مغرب اور مسلمان

آج کے دور میں میڈیا یا ذرائع ابلاغ کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' اور ''جس کے ہاتھ میں ڈوئی اس کے سب کوئی'' جیسے محاورے اب فرسودہ اور بے معنی ہو گئے ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں جو محاورہ سکۂ رائج الوقت کی حیثیت سے چل رہا ہے وہ ہے ''جس کے ہاتھ میں میڈیا اس کے ہاتھ میں پوری دنیا''۔ اگر آپ کے ہاتھ میں میڈیا ہے تو آپ طاقتور ہیں ورنہ آپ لاکھ دولت مند سہی، آپ کی کوئی حیثیت نہیں۔ بلکہ اگر آپ نے میڈیا کو اپنا مخالف بنالیا تو وہ آپ کی شبیہ اس قدر بگاڑ دے گا کہ پوری دنیا آپ سے نفرت کرنے لگے گی اور آپ کی دولت وثروت کسی کام نہیں آئے گی۔

جس قوم کے بازوؤں میں حالات کا رخ موڑ دینے کی قوت ہوتی ہے وہی قوم نہ صرف زندہ رہتی ہے بلکہ دوسری قوموں پر اپنی حاکمیت اور بالادستی بھی قائم کر لیتی ہے۔ جس کے بازوؤں میں قوت نہیں ہوتی اسے حالات سے سمجھوتہ کرنا ہوتا ہے اور خود کو ہوا کے دوش پر ڈال دینا ہوتا ہے۔ اگر کوئی ایسی قوم جس کی کلائیوں میں حالات کے دھارے کو موڑنے کی طاقت نہ ہو اور اس میں وقت سے سمجھوتہ کرنے کی صلاحیت بھی نہ ہو، بلکہ اس کے برعکس وہ مخالف سمت میں چلنے کی جرأت کرے، اور زمانے کو اپنا دشمن بھی بنالے تو وہ یا تو فنا ہو جاتی ہے یا ذلت وخواری کی زندگی جینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ہم اسے تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج

عالم اسلام ثانی الذکر صورت حال سے دوچار ہے اور دنیا پر مغرب کی برتری بڑھتی جارہی ہے۔ آج پوری دنیا کا میڈیا مغرب کے ہاتھ میں ہے اور اسی لیے مغرب انتہائی طاقتور ہے۔ اسے یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہے کہ اس زمانے میں میڈیا آلات حرب وضرب میں بھی شامل ہوگیا ہے اور وہ ایک ایسا ہتھیار بن گیا ہے جس کی مدد سے ایک عالم کو زیر نگیں کیا جاسکتا ہے۔ گیارہ ستمبر کے حملوں اور پھر افغانستان وعراق میں ہونے والی جنگوں میں اور اس کے بعد بھی میڈیا سے خوب کام لیا گیا اور لیا جارہا ہے۔ ایک جنگ زمین اور آسمان پر لڑی گئی اور دوسری ٹیلی ویژن، ریڈیو اور اخبارات میں لڑی گئی۔ مواصلاتی انقلاب نے کھلم کھلا جنگوں کے علاوہ در پردہ جنگوں میں بھی ایک نئی جہت پیدا کی ہے اور مغرب اس انقلاب کے سہارے پوری دنیا پر اپنی تہذیبی برتری قائم کرنے میں مصروف ہے۔

مسلمانوں یا عالم اسلام کی طرف سے اکثر یہ شکایت کی جاتی ہے کہ میڈیا ہماری شبیہ خراب کررہا ہے اور اس نے اسلام کے خلاف ایک در پردہ جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ یہ الزام یکسر بے بنیاد نہیں ہے لیکن اس کے ذمہ دار مسلمان بھی ہیں۔ گرچہ میڈیا مجموعی طور پر اسلام اور مسلمانوں کا دشمن نہیں ہے بلکہ اس کا ایک طبقہ انصاف پسند اور حق گو بھی ہے، لیکن اس کے باوجود مسلمان اس دوسرے طبقہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایک تو ان کے پاس نہ تو اپنا میڈیا ہے اور نہ ہی وہ میڈیا میں بڑے پیمانے پر داخل ہوکر اسکو اپنے حق میں کرنا جانتے ہیں اور دوسرے یہ کہ انھوں نے انصاف پسند طبقہ سمیت پورے میڈیا کو اپنا دشمن بنا رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انصاف پسند، حق گو اور مسلم نواز طبقہ کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن جاتی ہے۔

یہ ایک تلخ اور افسوسناک حقیقت ہے کہ آج عالم اسلام میڈیا کے رحم وکرم پر

ہے۔شاید یہ بات مبالغہ آمیز لگے لیکن ہے بالکل سچ کہ میڈیا نے مسلمانوں کو فٹبال بنا رکھا ہے۔وہ جب چاہتا ہے کوئی نہ کوئی تنازعہ کھڑا کر دیتا ہے اور پھر اس کی آڑ میں مسلمانوں کو رسوا کرنے کی ایک مہم چل پڑتی ہے۔مسلمانوں کی جانب سے مظاہرے اور احتجاج کیے جاتے ہیں اور ان مظاہروں اور احتجاجوں کی مدد سے بھی ان کو بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ایسا نہیں ہے کہ مسلمان میڈیا کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔وہ سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود عالمی پیمانے پر میڈیا کا جواب میڈیا سے دینے کا کوئی اجتماعی حوصلہ ان میں پیدا نہیں ہوتا۔انفرادی طور پر کوشش کی جاتی ہے جو بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوتی۔حالانکہ اب مسلمان بھی اس میدان میں خاصی تعداد میں آگئے ہیں لیکن اتنے سے بات بنتی نظر نہیں آتی۔جب تک بڑے پیمانے پر کوئی اجتماعی قدم نہیں اٹھایا جائے گا،اس وقت تک صورت حال میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آسکتی۔

زیر نظر کتاب میں عالم اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے میڈیا کے رویے اور اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے اور عالم اسلام کے خلاف اس کی در پردہ سازشوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کے ساتھ ہی میڈیا کے اس حلقے کی مثبت رپورٹنگ کا اعتراف بھی کیا گیا ہے جس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن جاتی ہے۔ایسے لوگ ہندوستان میں بھی معتد بہ تعداد میں موجود ہیں اور غیر ممالک میں بھی۔لیکن ہم ایسے لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے اور ان کو بھی دوسروں کی مانند اپنا مخالف سمجھتے ہیں یا کم ازکم ان سے دور دور رہتے ہیں۔اگر ہم ایسے لوگوں سے رابطہ رکھیں اور ان کو اپنے مسائل بتائیں،حقائق سے آگاہ کریں اور ان سے قربت حاصل کریں تو وہ لوگ ہمارا کیس اور مضبوطی اور مزید اعتماد سے لڑ سکتے ہیں۔بہر حال میں نے اس تصنیف کو بھی اپنی سابقہ تصنیف ''میڈیا روپ

اور بہروپ'' کی مانند معروضی اور متوازن رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ قارئین کریں گے۔ اس کتاب کی تصنیف کے لیے میں اپنی اہلیہ انیسہ انجم کا شکر گزار ہوں کہ انہی کی حوصلہ افزائی اور تحریک پر میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوسکا۔ اس پر تحریری شکل میں اپنی رائے دینے کے لیے میں پروفیسر اختر الواسع، جامعہ ملیہ کے صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، بزرگ قلم کار جناب ابن احمد نقوی اور وائس آف امریکہ اردو سروس کے نامہ نگار اور سینئر صحافی ڈاکٹر رضوان احمد کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اسے اس لائق سمجھا کہ اس پر اظہار خیال کریں۔ اگر میں الکتاب انٹرنیشنل کے مالک جناب شوکت سلیم صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں تو یہ انتہائی نامناسب بات ہوگی کیونکہ متعدد لوگوں کی جانب سے اسکی اشاعت کی ذمہ داری قبول کرنے کی پیش کش کے باوجود انہوں نے آگے بڑھکر اسے شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ تصنیف آپ کو کیسی لگی؟ اس پر اپنی رائے ضرور دیں۔ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کو بسروچشم قبول کرنے میں مجھے خوشی ہوگی۔

والسلام

سہیل انجم

مغرب اور اسلام

(موجودہ عالمی تناظر میں باہمی رشتوں کا جائزہ)

جب ہم مغرب اور اسلام کے رشتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسے واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ دکھائی دیتا ہے جو تلخ و ترش بھی ہیں اور خوشگوار و شیریں بھی، جو باہمی اعتماد و اعتبار سے بھی عبارت ہیں اور تصادم و ٹکراؤ سے بھی، جو مسلمانوں کی پُرعزم مہمات کی بھی یاد دلاتے ہیں اور متعدد مسلم مملکتوں کے سقوط کی بھی اور تاریخ ہمارے سامنے ایسے صفحات وا کر دیتی ہے جو عالم اسلام کی کامیابیوں و کامرانیوں کے بھی گواہ ہیں اور شکست و ریخت کے بھی۔ تاہم تاریخ کے صفحات پر ایسے واقعات کی بھرمار ہے جو مسلمانوں کے خون سے لالہ زار ہیں اور تاریخ کے متعدد ابواب ان کی روح پر لگنے والے زخموں کے نام معنون ہیں۔ یہ زخم اتنے کاری ہیں کہ ان سے آج بھی لہو ٹپک رہا ہے اور ان سے اٹھنے والی ٹیس آج بھی عالم اسلام کے غیور نوجوانوں کو تڑپاتی اور جھنجھوڑتی اور ان کے ضمیر پر کچوکے لگاتی رہتی ہے۔ مغرب اور اسلام کی کشمکش کا یہ سلسلہ ابتدائے اسلام سے ہی جاری ہے جو صلیبی جنگوں سے ہوتا ہوا آج کے افغانستان اور عراق تک پھیلا ہوا ہے۔ خون آشام واقعات سے پُر تاریخ کی اس شاہراہ پر جہاں مسلمانوں کی کامیابیوں کے متعدد سنگ میل نصب ہیں وہیں ان کی ناکامیوں اور ہزیمتوں کے ان مٹ نقوش بھی موجود ہیں جو ہمیں یہ یاد دلاتے رہتے ہیں کہ ہم نے کہاں کہاں غلطیاں کی ہیں اور کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں۔

صلیبی جنگیں تقریباً ڈیڑھ سو سال تک جاری رہیں اور ان جنگوں میں جہاں صلاح الدین ایوبی جیسے اولوالعزم، جرأت منداور باکردار غازی کی داستان شجاعت موجود ہے جو آج بھی ہمارے لہو میں حرارت بن کر دوڑ رہی ہے، وہیں مغربی طاقتوں کے ذریعے اسلامی تہذیب و ثقافت، علوم و اقتصادیات اور معیشت ومعاشرت کو گہرے زخم لگانے کے واقعات بھی موجود ہیں۔ صلیبی جنگوں کے خاتمے کے بعد سامراجی یلغار شروع ہوئی اور توسیع پسندانہ عزائم نے متعدد علاقوں کو عیسائیت کے زیرنگیں کردیا، جہاں مغلوب ومظلوم قوموں پر اپنی تہذیبی، ثقافتی اور لسانی برتری تھوپ دی گئی اور لاتعداد کالونیاں دنیا کے نقشے پر ابھرآئیں۔

مشرق وسطیٰ کا زخم:

تاریخ کے اس سفر پر کچھ اور آگے بڑھتے ہیں تو مشرق وسطیٰ کا باب دکھائی دیتا ہے۔ یہ باب بھی اسلام دشمن طاقتوں کی وحشت و بربریت اور ظلم وجبر کا گواہ ہے اور صہیونی عزائم کی کھلی کتاب ہے۔ یہاں ارض فلسطین پر بزور طاقت قبضہ کرنے کا آغاز ہوا اور 1919 میں اسرائیل کے قیام کا تصور پیش کیا گیا۔ 1922 میں برطانیہ اور فرانس نے ارض فلسطین پر یہودی مملکت کے قیام کی کوشش شروع کردی اور 1948 میں یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگیا۔ فلسطینیوں کی سرزمین پر یہودیوں کا ملک قائم ہوگیا اور پھر 1956 اور 1967 میں اسرائیلی توسیع پسندی نے اپنے بال و پر نکالے اور عربوں کی زمینوں کا بہت بڑا حصہ غصب کرلیا۔ اسرائیل نے مصر پر حملہ کرکے عربوں کے خلاف ایک کھلم کھلا جنگ کا اعلان کردیا اور چونکہ اس جنگ میں شام اور اردن بھی اسرائیل کے بالمقابل کھڑے تھے اس لیے اسرائیل نے شام کی گولان کی پہاڑیوں پر بھی غاصبانہ قبضہ جمالیا۔ اس جنگ میں امریکا نے کھل کر صہیونی طاقتوں کا ساتھ دیا اور اس کی مدد سے ہی گولان پر اسرائیلی قبضے کو ممکن بنایا

جا سکا۔ اس وقت سے لیکر آج تک صہیونی سازشیں جاری ہیں اور اسرائیلی توسیع پسندانہ عزائم وحشت و بربریت کی نو بہ نو داستانیں رقم کرتے جا رہے ہیں۔ جنگ کا میدان ہو یا مذاکرات کی میز یا پھر اسرائیل کا کوئی امن فارمولہ۔ ان سب کی تہہ میں بس یہی واحد مقصد کارفرما رہا ہے کہ فلسطینیوں کو ان کی اپنی سرزمین سے بے دخل کر کے عظیم تر اسرائیل کے قیام کا خواب پورا کیا جا سکے۔ مسئلہ فلسطین عالم اسلام کے قلب و روح پر ایک ایسا گہرا زخم ہے جس پر غیر جانبدار ممالک مرہم پاشی تو کرتے رہے ہیں مگر جس کو بار بار کریدا بھی جاتا رہا ہے۔ ہر طرح کی امریکی امداد سے لیس اسرائیلی رہنماؤں نے اس زخم کو اور گہرا کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں گنوایا۔ متعدد غیر جانبدار ممالک کی خارجہ پالیسی گرچہ فلسطین حامی رہی ہے لیکن اب بدلتے عالمی نظام اور واحد سپر پاور کی حیثیت سے امریکا کے ظہور اور عروج کے سبب یہ پالیسی کمزور پڑتی جا رہی ہے اور اب وہ ممالک بھی اسرائیلی وجود کو تسلیم کرنے لگے ہیں جو اسے ایک ظالم اور غاصب قوت سمجھتے رہے ہیں۔

مسئلہ فلسطین وہ واحد مسئلہ ہے جس پر تمام مسلم ممالک اسی طرح متحد ہیں جس طرح اسرائیل پر امریکا اور اس کے حامی ممالک۔ تنظیم اسلامی کانفرنس کے تمام ممبران آزاد فلسطینی مملکت کے قیام کی غیر متزلزل حمایت کرتے ہیں اور اسرائیل کی پشت پر پوری قوت کے ساتھ کھڑے رہنے پر امریکا، اس کے حامی ممالک اور بعض مغربی ملکوں پر شدید نکتہ چینی کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ صرف قراردادیں منظور کر کے اور زبانی حمایت کا اعلان کر کے اسرائیل کے توسیع پسندانہ عزائم کو نہیں روکا جا سکتا اور نہ ہی اس سے فلسطینیوں کی کوئی مدد ہو سکتی ہے۔ اخلاقی سپورٹ کی بنیاد پر جوش اور ولولے کے ساتھ میدان جنگ میں جایا تو جا سکتا ہے لیکن جدید ترین اور بھاری بھرکم ساز و سامان اور ہتھیاروں سے لیس دشمن طاقت پر

فتح نہیں پائی جاسکتی۔ فتح اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب اخلاقی سپورٹ کے ساتھ ساتھ تمام تر حربی سپورٹ بھی حاصل ہو۔ اسرائیلی رہنما اور فوجی فلسطین میں جس طرح انسانی قدروں کی مسلسل پامالی کررہے ہیں، کوئی بھی انصاف پسند اس کی حمایت نہیں کرسکتا۔ لیکن بہرحال اسرائیل کو ہر طرح کی حمایت اور امداد حاصل ہے اور فلسطینیوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جارہا ہے۔

وسطی ایشیا سے افغانستان اور عراق تک:

تاریخ کی یہ شاہراہ وسطی ایشیائی ممالک سے ہوتے ہوئے جہاں بہت سی مسلم قوموں کو غلام بنالیا گیا تھا، جو سوویت روس کے بکھراؤ کے ساتھ آزاد ہوگئیں، افغانستان اور عراق تک بھی جاتی ہے۔ اس سے قبل امریکا اور سوویت روس کی شکل میں دو سپر پاورس عالمی منظرنامے پر ابھر چکی تھیں۔ سوویت یونین نے افغانستان پر یلغار کرکے اس کو اپنے زیرنگیں کرلیا تھا۔ متوازی سپر پاور امریکا کو یہ کیسے برداشت ہوتا۔ لہٰذا اس نے افغان اور دوسرے مسلم نوجوانوں کو کروڑوں ڈالر کی امداد دے کر ٹریننگ دی اور انہیں روس سے لڑنے کے لیے افغانستان میں دھکیل دیا۔ اس کا نتیجہ یوں سامنے آیا کہ امریکا کی کھلم کھلا حمایت اور جنگ میں اس کی بالواسطہ شرکت سے مجاہدین نے روس کے دانت کھٹے کردیے اور اسے سرزمین افغانستان سے بھاگنے پر مجبور کردیا۔ اس کے بعد ہی سوویت یونین کا زوال شروع ہوگیا اور انتہائی قلیل عرصے میں وہ عالمی منظرنامہ سے غائب ہوگیا۔ امریکا واحد سپر پاور کی حیثیت سے ابھرا اور آج اس کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے۔

ایک اہم سوال:

اب یہاں ایک انتہائی اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ٹکراؤ اسلام اور مجموعی

طور پر مغرب کے مابین ہے یا عالم اسلام کا ٹکراؤ بعض مغربی ممالک سے ہے؟ اس سوال کا جواب تاریخی واقعات کے تناظر میں تلاش کیا جانا چاہیے، کیونکہ اس کے جواب ہی میں فوکو یامہ کے نظریہ ''خاتمہ تاریخ'' یا End of History اور سیموئیل ہننگٹن کے نظریہ ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' یا Clash of Civilization کا جواب بھی پوشیدہ ہے۔ اگر ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام اور مجموعی طور پر مغرب کے مابین ٹکراؤ ہے تو پھر بوسنیا، کوسوؤ اور چیچنیا میں مسلمانوں کی جانب سے لڑی جا رہی جنگوں میں بعض مغربی اقوام کی حمایت کو کس خانے میں رکھیں گے۔ خیال رہے کہ ان ملکوں میں مسلمانوں کی جنگیں عزت نفس اور حق خود ارادیت کے لیے تھیں۔ یہ سچائی بھی ہمارے سامنے ہے کہ سرد جنگ کے دوران مسلم ممالک اور ان کی مذہبی جماعتوں کا 'نظریاتی تعلق کے سبب مغرب کے ساتھ بہت مضبوط رشتہ رہا ہے اور اس رشتے کو مغربی دانشوروں کی تائید بھی حاصل رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مسلم ممالک ایسے ہیں جو مغرب مخالف ہیں مگر ایسے ممالک میں اپنی مذہبی جماعتوں کو کچلنے کی بھی تاریخ رہی ہے۔

مذکورہ سوال کا ضمنی سوال یہ ہے کہ کیا اسلام اور عیسائیت ایک دوسرے کے دشمن ہیں؟ اسلام کے تعلق سے پوپ بنیڈکٹ سولہویں کے بعض قابل اعتراض بیانات کے باوجود بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ اسلام اور عیسائیت میں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ معروف دانشور ایڈورڈ سعید اپنی تصنیف کورنگ اسلام (Covering Islam) میں اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے کہتے ہیں ''ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مغرب ہی اسلام سے ہمیشہ نبرد آزما رہا ہے نہ کہ عیسائیت۔'' ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ''قرون وسطی کے بیشتر ادوار اور فرانس میں نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی دور میں اسلام کو ایک آسیب زدہ اور ''کافروں'' کا مذہب اور محمد (صلی اللہ

علیہ وسلم) کو ایک جھوٹا نبی کہا جاتا رہا ہے اور آج بھی بہت سے عیسائی یہی مانتے ہیں...... دراصل مشرق کی کئی تہذیبوں نے مغرب کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور وہ صرف اسلام ہی تھا جس نے کبھی بھی مغرب کے آگے اپنا سر نہیں جھکایا۔''

صلیبی جنگوں کے اسباب:

اگر ہم صلیبی جنگوں کے اسباب پر نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا ان کی تہہ میں عیسائی مذہب کی نہیں بلکہ داخلی انتشار و کشمکش کی کارفرمائی بھی دکھائی دیتی ہے۔ مذکورہ حلقوں کے مطابق گیارہویں صدی عیسویں میں یوروپ میں داخلی تنازعات بہت بڑھ گئے تھے اور سیاسی و معاشی بحران پیدا ہو گیا تھا۔ مغربی ملکوں کے مابین شدید کشمکش بھی جاری تھی جس کو حکمت عملی کے ساتھ دوسری طرف موڑنے کی ضرورت تھی۔ مغربی معاشرے کو انتشار سے بچانے کے لیے عیسائی پادریوں اور مذہبی پیشواؤں نے اسلام کے خلاف کروسیڈ یعنی ''مقدس جنگ'' کی چنگاریاں بھڑکانی شروع کر دیں، انھوں نے اسلام کے خلاف جنگ کو اللہ کا فرمان قرار دیا اور اس وقت کے پادری اربن دوم نے اپنی پر جوش خطابت سے عیسائیوں کو اس قدر اکسایا اور بھڑکایا کہ صلیبی جنگوں کا آغاز ہو گیا۔ اس نے مغرب کو داخلی انتشار سے نجات دلانے کے لیے عیسیٰ مسیح کے گہوارہ کو آزاد کرانے کا نعرہ دیا اور پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تلقین کی۔ کلرمونٹ اجتماع میں، جہاں پہلی مقدس جنگ یا کروسیڈ کا اعلان کیا گیا تھا، اربن دوم نے کہا کہ ''وہ شہر جو شاہوں کے شاہ کا شہر ہے شومیٔ قسمت سے کافروں (مسلمانوں) کے ہاتھوں ذلت و رسوائی سے دوچار ہے۔ وہ گرجا گھر جسے عیسیٰ مسیح کا مرقد ہونے کا شرف حاصل ہے، اور جہاں وہ دوبارہ زندہ ہو کر دنیا میں نمودار ہوں گے، ان ملعونوں کے ذریعہ نجس اور ناپاک ہو گیا ہے، جن کے لیے نہ صرف جنت میں کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ ان کا ابدی ٹھکانہ

جہنم ہے جس کی کبھی نہ بجھنے والی آگ کا وہ ایندھن بنیں گے۔'' اس جنگ کا نعرہ تھا ''خوں ریزی ہی اللہ کی عین مرضی ومنشاء ہے۔'' اس طرح اس نے اپنے حامیوں کو للکارا کہ وہ میدان جنگ کی طرف دوڑیں اور اپنے خنجروں کو ''ملحد دشمنوں'' (مسلمانوں) کے سینوں میں اتار دیں۔ عیسائی پادریوں نے عیسائی عوام کے دلوں میں غیظ وغضب کے شعلے بھڑکا دیے اور مسلمانوں کے خلاف انتہائی اہانت آمیز زبان کا استعمال کیا۔ جس کے نتیجے میں صلیبی جنگوں کا آغاز ہو گیا، جو کم وبیش ڈیڑھ سو برسوں تک جاری رہیں۔

اس نظریہ کے تحت ایڈورڈ سعید کی یہ بات سچ ثابت ہو جاتی ہے کہ ہمیشہ مغرب ہی اسلام سے نبرد آزما رہا ہے نہ کہ عیسائیت۔ ان ماہرین کے دلائل کی پختگی بھی مسلم ہو جاتی ہے جن کا کہنا ہے کہ اسلامی اور عیسائی تہذیب میں نہ کبھی ٹکراؤ تھا نہ آئندہ ہوگا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صلیبی جنگوں کے دوران ہی مغرب میں علوم وفنون اور سائنس ٹکنالوجی کی ترقی کی ضرورت پیش آئی اور اسلامی علوم وفنون اور سائنسی میدان میں مسلمانوں کی بیش بہا خدمات سے استفادہ کا سلسلہ شروع ہوا اور مغربی زبانوں میں ان کا ترجمہ کیا جانے لگا۔ اسی کے ساتھ مشرقی علوم میں بحث وتحقیق کی ایک تحریک وجود میں آئی۔ اس تحریک کا ایک دوسرا مقصد یہ تھا کہ اہل مغرب کی نگاہوں میں مسلمانوں کی شبیہ خراب کر دیں اور اسلام تک ان کے پہنچنے کے راستے میں ایک دیوار حائل کر دیں۔ اس لیے مسلمانوں اور اہل اسلام پر متعدد گھناؤنے الزامات بھی لگائے گئے جو تعصبات پر مبنی تھے۔

اسلام مغرب کا دشمن نہیں:

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ عالم اسلام مغرب کا دشمن ہے تو اس کی تائید تاریخی حقائق نہیں کرتے۔ تاریخ کے مطالعہ سے جو صورت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہی ہے کہ اسلام نہ تو مغرب کا دشمن ہے نہ عیسائیت کا۔ ایک امریکی دانشور ہارورڈ یونیورسٹی

میں مذاہب کے تقابلی مطالعات کی پروفیسر اور ''ایک نیا مذہبی امریکا'' کی مصنف Diana L.Eek (ڈائنا ایل۔اِک) مسلمانوں عیسائیوں اور یہودیوں کو Cousin یعنی رشتے کے بھائی بتاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ وہ بھائی ہیں مگر ان میں بدگمانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔

امریکا اور برطانیہ پر دہشت گردانہ حملوں کو تہذیبوں کے ٹکراؤ یا اسلام بمقابلہ مغرب کے طور پر نہیں بلکہ امریکی و برطانوی خارجہ پالیسی کے خلاف بعض منحرف عناصر کے غصے اور ناراضگی کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ان دونوں ملکوں نے اسرائیل کی جس طرح مسلسل حمایت جاری رکھی ہے، یہ حملے اس کے خلاف ناراضگی کے عکاس ہیں۔ اسامہ بن لادن اور اس کے دوسرے ساتھیوں کے روز بہ روز جاری ہونے والے نو بہ نو ٹیپس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ مسلمانوں اور اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بلکہ بہت سے لوگوں کو ان ٹیپس کی حقیقت پر ہی شبہ ہے گرچہ اسامہ بن لادن دعوی کرتا ہے کہ وہ اسلام کی طرف سے بول رہا ہے لیکن کوئی بھی مسلم نہ تو اس کی تائید وتصدیق کرتا ہے اور نہ ہی اس کے دعوے کو تسلیم کرتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس بیشتر مسلم ممالک القاعدہ کے دہشت گردانہ حملوں اور اس کے نظریات کی مذمت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام میں ان چیزوں کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مسلم ممالک بھی دہشت گردی مخالف جنگ میں امریکا کا ساتھ دینے کا عہد کرتے ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ آج القاعدہ اور اس کے رہنماؤں کو عام مسلمانوں کی طرف سے کوئی سپورٹ نہیں مل رہی ہے۔

میڈیا کی زہر افشانی:

سچائی یہ ہے کہ اسلام مغرب کا دشمن نہیں ہے۔ یہ تو میڈیا ہے جس نے یہ تصور پیدا کیا ہے۔ میڈیا انتہا پسندی اور دہشت گردی کی آڑ میں عالم اسلام کو ہدف تنقید

بناتا ہے اور اسے مغرب کے دشمن کے طور پر پیش کرتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو مغرب دشمن، تہذیب سے عاری، اسٹیریوٹائپ، اکھڑ، بدمزاج، بدمذاق، پسماندہ اور جاہل گنوار قرار دیتا ہے اور یہ پروپیگنڈہ کرتا ہے کہ اسلام اور عالم اسلام صلح وآشتی اور مصالحت وخیر سگالی میں نہیں بلکہ ٹکراؤ اور تصادم میں یقین رکھتے ہیں۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ وہ اس پروپیگنڈہ میں کامیاب ہے اور آج اس پر یقین کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ میڈیا ہی نے اسلامی علامتوں اور شعائر کے خلاف ماحول سازی کی ہے۔ خواہ وہ اسکارف کا معاملہ ہو یا داڑھی کا، حجاب کا معاملہ ہو یا اسلامی لباس کا، میڈیا ہی نے اسلامی علامتوں اور نشانیوں کو پسماندگی کے مظاہر کے طور پر پیش کیا ہے۔ میڈیا ہی نے اہانت آمیز کارٹونوں کی اشاعت کی اور آزادیٔ اظہار کے نام پر ان کی غیر متزلزل حمایت کی۔ مسلمانوں نے جب اس کے خلاف احتجاج کیا تو اسے مغرب دشمنی کی طرف موڑ دیا گیا۔ مسلمانوں نے ان کارٹونوں کی اشاعت پر معافی کا مطالبہ کیا تو مغربی حکومتوں، دانشوروں اور صحافیوں نے اس سے انکار کیا۔ میڈیا نے آزادیٔ اظہار کا نعرہ تو لگایا مگر اہانت انگیزی کے تعلق سے جو قوانین موجود ہیں ان سے عمداً چشم پوشی بھی کی۔

باہمی علوم وتجربات سے استفادہ:

دراصل اسلام اور مغرب کے مابین تصادم کا تصور صدیوں میں قائم ہوا ہے۔ اس کی جڑ تاریخ میں پیوست ہے اور اسے صدی بہ صدی پختہ اور پختہ تر کیا جاتا رہا ہے۔ اس طرح دونوں تہذیبوں کے مابین لسانی، ثقافتی، ادبی اور روایتی بُعد پیدا کر دیا گیا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان میں صدیوں سے ثقافتی تبادلہ بھی پہلو بہ پہلو چلا آ رہا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے علوم سے استفادہ کیا ہے۔ آپ قرون وسطی پر نظر ڈالیں یا اس کے بعد کی تاریخ پر یہ ثقافتی اور علمی

تبادلے ہر دور میں دکھائی دیں گے۔ سائنس اور حساب کا علم ہو یا سفارت، تجارت اور تکنیکی و تعلیمی تحقیق ہو، ادویات و اسپتال کا شعبہ ہو یا کھلی اور آزاد سرحدوں کا تصور ہو۔ مغرب نے ان شعبوں میں اسلام سے استفادہ کیا ہے۔ قرون وسطیٰ میں اسلام نے عیسائیوں اور یہودیوں کو اپنے عقائد پر چلنے کی پوری آزادی دی اور ان پر کوئی مذہبی پابندی نہیں لگائی۔

گیارہ ستمبر کے واقعات کے تناظر میں ایسا لگتا ہے کہ اسلام اور مغرب اپنے تعلقات کے چوراہے پر آ کھڑے ہوئے ہیں جہاں سے وہ اپنی اپنی راہ لیں گے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ تباہ کن اثرات کے حامل عالمی ٹکراؤ سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ بین العقائد مذاکرات تیز ہوں اور اعتدال پسند طبقات سامنے آئیں۔ مسلمان صرف مشرق وسطیٰ یا اسلامی ممالک تک ہی محدود نہیں ہیں۔ آج ان کی آبادی پوری دنیا میں پھیل رہی ہے۔ بلقان میں وہ صدیوں سے آباد ہیں۔ وہ مسلم ممالک سے ہجرت کر کے امریکا، برطانیہ، یوروپ اور دیگر ممالک میں آباد ہو رہے ہیں۔ مغربی یوروپ میں آج ایک کروڑ مسلمان ہیں اور امریکا میں ان کی تعداد لاکھ سے زائد ہے۔ امریکا اور برطانیہ میں نومسلموں کی بھی خاصی تعداد موجود ہے۔ ادھر گلوبلائزیشن سے اختلاف کے باوجود یہ کہنا پڑے گا کہ اس نے مختلف اقوام اور اعتقادات کا انحصار ایک دوسرے پر بڑھا دیا ہے۔ پوری دنیا ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ ایسے میں ضرورت ٹکراؤ کی نہیں مفاہمت اور مصالحت کی ہے۔ ڈائلاگ اور مذاکرات کو تیز کرنے کی ہے۔

سیاسی کارفرمائی:

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے صفحات پر خوں چکاں تصادموں کے جو واقعات بکھرے پڑے ہیں ان کے پس پردہ سیاستدانوں کے عزائم کارفرما رہے ہیں نہ کہ

مذہبی عقائد و نظریات۔ کوئی بھی مذہب ٹکراؤ کا درس نہیں دیتا اور اسلام تو سلامتی کا مذہب ہے۔ سیاسی رہنماؤں نے اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے جس میں بداعتمادی کی مسموم ہوائیں چل رہی ہیں جو خوشگوار رشتوں کے حق میں زہر قاتل ہیں۔ ان عناصر نے اسلام کی حقانیت کو دبانے کے لیے مغربی ممالک میں اس قدر اسلام کا خوف پیدا کر دیا ہے کہ اس کا نام آتے ہی لوگ خطرہ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ بہت شدت سے یہ پروپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ اگر اسلام اور مسلمانوں کو نہیں روکا گیا تو وہ ہمارے تہذیبی ورثے کو مٹا دیں گے اور ہماری بالادستی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اسلام خوف کا نہیں پیار کا مذہب ہے، منافرت کا نہیں یگانگت کا مذہب ہے، تباہی و بربادی کا نہیں سلامتی کا مذہب ہے، ٹکراؤ اور تصادم کا نہیں صلح و آشتی کا مذہب ہے۔ اسلام کسی کو خوفزدہ کرنے کے لیے نہیں آیا بلکہ دنیا کو رحمت کے سائے تلے لے جانے کے لیے آیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاسی رہنماؤں نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے جو خطرناک فضاء بنا دی ہے اسے درست کیا جائے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب بین المذاہب اور بین العقائد ڈائلاگ تیز ہوں، لوگ ایک دوسرے کو سمجھیں اور غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی عینک اتار کر چشم حقیقت بیں سے ننگی سچائیوں کا مشاہدہ کریں۔

مسلمانوں کے لیے کرنے کے کام:

آج سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی نے مسلمانوں کو بھی موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ اس کی مدد سے پوری دنیا میں اسلام کی دعوت کو عام کریں۔ مواصلات اور ذرائع ابلاغ کے اس انقلاب آفریں دور میں مغرب اور عالم اسلام میں بھی لوگوں کا ذہنی افق کشادہ اور وسیع ہوا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے اور وسیع کیا جائے اور اسکی سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کو ہے۔ وہ اگر اسلام کی حقانیت کو عالمی پیمانے پر

عام کرنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ شمشیر برہنہ بننے کے بجائے پیکر صلح و آشتی بنیں اور مغرب و اہل مغرب کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

آج مغرب میں بیک وقت کئی نظریات پائے جاتے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کا دوسری تہذیبوں سے ٹکراؤ ناگزیر ہے بلکہ یہ ٹکراؤ شروع ہو گیا ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ خود مغربی تہذیب کے اندر ٹکراؤ ہوگا۔ تیسرا نظریہ یہ ہے کہ پوری دنیا کے عوام مغرب کے سیاسی گلوبلائزیشن اور معاشی سرمایہ دارانہ نظام کی طرف مائل ہیں اور اس کا نتیجہ تاریخ کے خاتمہ کی شکل میں برآمد ہوگا۔ اور چوتھا اور آخری نظریہ یہ ہے کہ مختلف مذاہب اور عقائد کے مابین بقائے باہم کی گنجائش موجود ہے۔ عالم اسلام کو اسی آخری نظریہ کے تحت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ بقائے باہم کے ماحول میں ہی اسلام کی ترویج و تشہیر ہو سکتی ہے۔ حقیقت پسندی مذہب اسلام کا جز ولاینفک ہے اور مسلمانوں کو حقیقت پسندی سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ اسلام کی دعوت کو اسی وقت عام کر سکتے ہیں اور لوگوں کو اسلام کی طرف بلا سکتے ہیں جب وہ خود تنگ نظری کے دائرے سے باہر آئیں اور وسیع القلبی و وسیع النظری کا مظاہرہ کریں۔ جب تک یہ نہیں ہوگا ٹکراؤ کا خطرہ بنا رہے گا اور اس خطرے کو دور کرنے کی ذمہ داری مسلمانوں پر زیادہ عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ خوف و دہشت اور بدگمانی و بدعہدی سے پاک ماحول میں ہی اسلام کی دعوت عام ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے۔

اسلام کے بارے میں میڈیا رپورٹنگ

اس وقت عالمی سطح پر دو باتیں بہت نمایاں ہیں۔ایک اسلام مخالف جارحیت میں شدت اور دوسری اسلام کی مقبولیت میں اضافہ۔مغرب نے ہمیشہ سے اسلام کو اپنا دشمن سمجھا ہے۔تاہم کمیونزم کے زوال کے بعد اس نے اسلام کو اپنا دشمن نمبر ایک مان کر اس کے خلاف جارحیت، اشتعال انگیزی اور منظم سازش کے سلسلے کو اور دراز کر دیا ہے۔ 11 ستمبر کو امریکا پر دہشت گردانہ حملے کے بعد اسلام دشمنی کی تاریخ میں مزید اوراق جڑ گئے ہیں اور اسلام کو اپنا دشمن ماننے والوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اسلام مخالف تحریک کو شدت اور طاقت فراہم کرنے میں مغربی میڈیا کے ایک طبقے کا زبردست رول ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ طبقہ اسلام دشمن تحریک سے الگ ہو جائے تو اس تحریک کی ہوا نکل جائے گی۔

اسلام کی مقبولیت میں اضافہ:

تاہم یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسلام کے خلاف جتنی شدت سے تحریک چلائی جا رہی ہے، اتنی ہی تیزی سے اسلام کی مقبولیت میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔امریکا، برطانیہ، ہالینڈ، ڈنمارک، سویڈن، نیدرلینڈ اور دیگر ممالک میں لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ آخر اسلام کو اس قدر کیوں نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ کیا واقعی اسلام ایک دہشت گرد مذہب ہے۔کیا اس کے پیروکار انتہا پسند اور جنونی

ہیں؟ کیا اسلام اور قرآن کی تعلیمات واقعی قتل وخوں ریزی اور تشدد کو ہوا دیتی ہیں؟ اور کیا یہ بات سچ ہے کہ اسلام مغرب کے لیے اور اس کی تہذیب کے لیے سب سے بڑا خطرہ اور چیلنج بن گیا ہے؟ لوگ اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کو بے چین ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی اسلام وہی ہے جو بعض نام نہاد مسلم تنظیموں کی جانب سے اسلام کے نام پر کیا جارہا ہے یا اسلام کچھ اور تعلیم دیتا ہے۔ اسلام کس طرز زندگی کی بات کرتا ہے اور دوسرے مذاہب اور ان کے پیروکاروں کے تعلق سے اس کا کیا نظریہ ہے۔ وہ اسلام کو جاننے کے ساتھ ساتھ جانچنا اور پرکھنا بھی چاہتے ہیں اور ان الزامات کا صحیح تناظر میں جائزہ لینا چاہتے ہیں جو اسلام پر عائد کئے جارہے ہیں۔ اسلام کو جاننے اور سمجھنے کی خواہش میں جب مغرب کا تعلیم یافتہ طبقہ غیر جانبدارانہ انداز میں اسلام کے قریب آتا ہے تو وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے کہ اسلام کی تصویر تو اس تصویر سے کہیں الگ ہے جو مغرب بناتا ہے اور پوری دنیا میں پیش کرتا ہے۔ اسلام کا تو ان الزامات سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے جو اس پر عائد کئے جارہے ہیں۔ انہیں یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ اسلام ظلم وتشدد اور خون خرابے کا نہیں بلکہ امن وامان کا مذہب ہے۔ وہ دوسرے مذاہب اور ان کے پیروکاروں کے خلاف نہیں ہے بلکہ ان کے احترام کی بات کرتا ہے۔ اسلام دہشت گردی اور ظلم وزیادتی کو ختم کرنے کی بات کرتا ہے۔ وہ مساوات کی تعلیم دیتا ہے اور دبے کچلے طبقات کو انسانی حقوق فراہم کرنے کی بات کرتا ہے۔ جب تعلیم یافتہ مغربی نوجوان ان حقائق سے روبرو ہوتے ہیں تو ان کے سامنے کوئی وجہ نہیں رہ جاتی کہ وہ اسلام مخالف پروپیگنڈے کو یکسر مسترد کردیں اور اسلام کی آغوش میں چلے جائیں۔ یہی سبب ہے کہ آج پوری دنیا میں اسلام کی مقبولیت بڑھ رہی ہے اور مشرف بہ اسلام ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔ یہ بات صرف مسلم

دانشور اور تعلیم یافتہ طبقہ ہی نہیں کہہ رہا ہے بلکہ مغربی ممالک کے انصاف پسند دانشور بھی کہہ رہے ہیں کہ آج اسلام امریکا، برطانیہ اور دیگر ملکوں میں تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن گیا ہے۔ گویا جو تیر اسلام پر چلایا گیا تھا وہ پلٹ کر خود اس کے دشمنوں کے سینوں پر لگ رہا ہے اور وہ اسلام کی عالمی و آفاقی مقبولیت میں اضافہ سے بوکھلا اٹھے ہیں۔

مغربی میڈیا کا بکاؤ مال:

یہی وجہ ہے کہ آج مغربی میڈیا میں اسلام اور مسلمانوں کی کوریج کا حجم کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے اور اس پر تحقیق ہونے لگی ہے کہ ۱۱/ستمبر کے بعد مغربی میڈیا کی مسلم کوریج میں کس قدر اور کتنے فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ آج دنیا میں کہیں بھی دہشت گردی کے واقعات ہوتے ہیں تو فوراً اس کے ڈانڈے اسلام سے ملائے جانے لگتے ہیں اور بغیر تحقیق کے اسلامی تنظیموں یا نام نہاد مسلم تنظیموں کا نام لے لیا جاتا ہے۔ پھر یہ پروپیگنڈہ تیز ہو جاتا ہے کہ اسلام مغربی تہذیب کے لیے بہت بڑا خطرہ بن گیا ہے اور اس خطرہ سے مقابلہ کرنے کے لیے مغرب کو متحد ہو جانا چاہیے۔ آج اسلام مغربی میڈیا میں سب سے زیادہ پڑھا اور سنا جا رہا ہے اور اس کے ناظرین، سامعین اور قارئین کے پیش نظر ہی اسلام کو مختلف طریقوں سے اپنا موضوع بنایا جا رہا ہے۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج مغربی میڈیا کی دکان میں سب سے زیادہ بکنے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ "اسلام" ہے۔ کہیں مثبت تصویر کشی کے ساتھ کہیں منفی تصویر کشی کے ساتھ۔

اسلام مخالف رپورٹنگ:

اگر کوئی ایسا شخص جو اسلام سے بالکل ہی نابلد ہو اور اس کے بارے میں ایک

لفظ بھی نہ جانتا ہو، مغربی میڈیا کے ایک طبقے کی رپورٹنگ کا جائزہ لے تو بلا جھجک اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو نہ صرف مغربی معاشرہ بلکہ پوری دنیا کے لیے انتہائی خطرناک ہے اور مسلمان عالمی امن کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ ایسی رپورٹنگ کی بنیادی وجہ اسلام دشمنی ہی ہے۔ البتہ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے جونیئر رپورٹر اسلام سے ناواقفیت کی بنیاد پر بھی ایسی رپورٹنگ کرتے ہیں جس سے اسلام اور مسلمانوں کی مسخ شدہ تصویر سامنے آتی ہے۔ عملی طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی رپورٹر کسی واقعہ کی رپورٹ بنا کر ڈیسک پر بیٹھے ذمہ دار عہدوں پر فائز بااختیار لوگوں کو دیتا ہے تو وہاں پر تخریب کاری کی جاتی ہے۔ وہ لوگ رپورٹ کوئی شکل دیتے ہیں اور اس میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں دہشت گردی، انتہا پسندی، مسلم دہشت گرد، مسلم جنونی، ریڈیکل اسلام اور ایسی بہت ساری اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی داغدار تصویر بنانے میں معاون و مددگار ہوں۔ حقائق کو اس طرح توڑ مروڑ کر اور نمک مرچ لگا کر پیش کیا جاتا ہے کہ اسلام اور مسلمان انتہائی خطرناک نظر آنے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی رپورٹ ان اصطلاحات کے بغیر بھی پیش کر سکتے ہیں، یا انتہا پسند اور بنیاد پرست مسلمان کے بجائے احیاء پسند اور پروگریسیو مسلمان بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا جاتا۔ تاہم سارے صحافی ایسے نہیں ہیں۔

بنیاد پرستی کی اصطلاح:

چونکہ میڈیا آج کے دور کا سب سے طاقتور ہتھیار ہے اس لیے وہ اسلام اور مسلمانوں کی جیسی شکل پیش کرتا ہے، اسی کو لوگ سچ ماننے لگتے ہیں۔ میڈیا اسلامی بنیاد پرستی کی اصطلاح بھی خوب استعمال کرتا ہے اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ بنیاد پرستی یا Fundamentalism کی غلط تشریح و تاویل کرتا ہے۔ بنیاد پرستی کا مطلب یہ

ہے کہ کسی چیز کی بنیادوں کو ماننا اوران پر عمل کرنا۔ اگر کوئی مسلمان بنیاد پرست ہے تو وہ ایک پکا سچا مسلمان ہوگا۔ ہر مذہب چاہتا ہے کہ اس کی بنیادی باتوں پر عمل کیا جائے۔لیکن جب مسلمان اسلام کی بنیادی باتوں کو مانتا اوران پر عمل کرتا ہے تو اسے دوسرا رنگ دیدیا جاتا ہے۔ اسلام کے پانچ بنیادی ستون کو ماننے والا ہی اصلی مسلمان ہے یعنی وہی بنیاد پرست مسلمان ہے۔لیکن میڈیا کی کرم فرمائی کے نتیجے میں بنیاد پرستی ایک گالی بن گئی ہے اور آج اسی پروپیگنڈے کے نتیجے میں بعض مسلمان بھی خود کو بنیاد پرست مسلمان کہلانے سے ڈرتے ہیں۔

جہاد اور فتویٰ:

اسی طرح جہاد کو بھی غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ جہاد کا جو حقیقی اور اسلامی مفہوم ہے اس کو الگ تھلگ رکھ دیا گیا ہے اور تلوار لیکر نکل پڑنے ،خودکش حملے کرنے اور معصوموں کا خون بہانے کو ہی جہاد بتایا جارہا ہے۔یعنی جہاد کے مفہوم کو بالکل الٹ دیا گیا ہے۔ دراصل جہاد بالسیف کی اجازت مخصوص حالات میں ہی دی جاتی ہے۔ایک اور اسلامی اصطلاح فتویٰ کو بھی غلط رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔آج کوئی بھی داڑھی ٹوپی والا مسلمان اگر کوئی اعلان کرتا ہے تو اسے فتویٰ قرار دے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ فتویٰ صرف ایک مفتی دے سکتا ہے اور خاص معاملات اور مخصوص پس منظر ہی میں دے سکتا ہے۔میڈیا کس طرح بنیاد پرستی اور ہتھیاروں اور نماز کو ایک دوسرے سے جوڑ کر دیکھتا ہے اسکی مثال ایک تصویر اوراس کے کیپشن سے دی جاسکتی ہے۔ جب افغانستان میں امریکا سے جنگ چل رہی تھی تو کسی مقام پر بعض مسلمان سامنے بندوق رکھ کر نماز ادا کر رہے تھے۔ ٹائم میگزین نے اس تصویر کو چھاپ کر یہ کیپشن لگایا کہ'' یہ دیکھئے بنیاد پرستوں کی جنگ میں بندوق اور نماز ساتھ ساتھ ہیں۔'' حالانکہ یہ تو'' آ گیا عین لڑائی میں اگر

وقت نماز'' والا معاملہ تھا۔ لیکن اسے دوسرا رنگ دینے کی کوشش کی گئی۔ بعض مغربی صحافیوں اور مغربی دانشوروں نے جہاد کے بارے میں قرآنی آیات کو سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کر کے بھی جہاد کے اصل مفہوم کو توڑنے مروڑنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس قول کو کبھی پیش نہیں کیا کہ ''سب سے بڑا جہاد اپنے نفس سے جہاد ہے۔'' بلکہ ایک آیت کے اس مفہوم کو سیاق وسباق سے کاٹ کر بار بار پیش کیا گیا کہ ''اللہ کے لیے ان کے خلاف جنگ کرو جو آپ کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ لیکن ان پر پہلے حملہ نہ کرو۔ اللہ جارحیت کو پسند نہیں کرتا۔'' اس پوری آیت کو پیش کرنے کے بجائے صرف پہلے حصے کو پیش کیا جاتا ہے اور وہ بھی اپنے انداز میں۔

اسلام کا تشدد سے رشتہ:

اسلام اور تشدد کے بارے میں بھی گمراہ کن انداز میں پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ میڈیا کا ایک طبقہ تشدد کو اسلام سے جوڑ کر پیش کرتا ہے اور یہ ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔ اس نظریے کو اتنی شدت سے پیش کیا گیا ہے کہ اسلام سے ناواقف لوگ اسی کو سچ سمجھنے لگے ہیں۔ اسی لیے جب میڈیا تشدد کا رشتہ اسلام سے جوڑ کر دکھاتا ہے تو لوگوں کو اس پر آسانی سے یقین آجاتا ہے۔ میڈیا اور مغربی تاریخ دانوں کا یہ پروپیگنڈہ ہے کہ مسلمان تلوار لیکر دنیا کے ایک کونے سے نکلے اور لوگوں کو یہ کہتے اور مارتے کاٹتے چلے گئے کہ یا تو اسلام قبول کرلو یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر نہیں بلکہ اپنی تعلیمات اور حضور اکرمؐ کے اسوۂ اور صحابہ کرام کے حسن اخلاق سے پھیلا۔ لوگوں نے پڑھ کر اور اس کے بارے میں جان کر اسلام قبول کیا نہ کہ تلوار کے ڈر سے۔ لیکن چونکہ مغربی معاشرہ کو اسلام کے بارے میں معلومات صرف میڈیا سے ہی حاصل ہوتی ہیں اس لیے وہ اسی کو بے چون وچرا سچ مان لیتا ہے جو میڈیا اس

کے سامنے پیش کرتا ہے۔

نادرست رپورٹنگ:

میڈیا عرب اور مسلم معاشرے کے واقعات کو اپنے انداز میں دکھاتا ہے مگر اس کے پس منظر کو نہیں دکھاتا، اسے جان بوجھ کر چھپا دیتا ہے۔ وہ اسلامی ملکوں کے سیاسی معاملات اور مذہب کو ایک بتاتا ہے۔ جبکہ دونوں الگ الگ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر صدام حسین کے اقدامات کو اسلامی اقدامات بتا کر پیش کیا جاتا تھا۔ خلیجی جنگ کو اسلامی جنگ بنا کر پیش کیا گیا۔ اور اس طرح یہ دکھانے کی کوشش کی گئی کہ اسلام میں جنگ سے کتنی رغبت ہے اور جنگ اس مذہب میں کس قدر پسندیدہ ہے۔ ایسی چیزوں کو صحیح تناظر میں نہ پہلے پیش کیا جاتا تھا نہ آج پیش کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہٹلر عیسائی مذہب کا ماننے والا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے اقدامات عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق تھے یا ان کو عیسائی مذہب سے جواز فراہم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح صدام حسین کے تمام اقدامات کو اسلامی اقدامات قرار دینا یا اسلام سے ان کو جواز فراہم کرنا گمراہ کن ہے۔

فلسطینیوں کے ذریعہ طیاروں کا اغوا، تہران میں طلبا کے ذریعے امریکی سفارتخانے کا محاصرہ اور ادھر واشنگٹن اور نیویارک پر دہشت گردانہ حملوں، بعض دہشت گردوں کے ذریعے ایئر انڈیا کے طیارے کا اغوا کر کے قندھار لے جانا اور ایسے ہی دیگر معاملات کا رشتہ اسلام سے جوڑ کر گمراہ کن انداز میں پیش کیا گیا ہے اور عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی گئی ہے۔ ٹیلی ویژن پر تصویروں، موشن پکچر اسکرین، میگزین، ریڈیو اور اخبارات میں کامکس کے ذریعے بھی اسلام اور مسلمانوں کی منفی تصویر پیش کی جاتی ہے۔

میڈیا غیر حقیقت پسندانہ اور نادرست رپورٹنگ سے بھی اسلام کی ایک منفی

تصویر بناتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ اس انداز سے خبریں بنائے گا کہ ——— پانچ مسلمانوں نے تین اسرائیلیوں کو ہلاک کردیا۔ جبکہ اسے کہنا چاہیے کہ پانچ فلسطینیوں نے تین اسرائیلیوں کو ہلاک کردیا۔ یا گلاسگوایئرپورٹ پر ایک مسلم نوجوان نے بارود سے بھری گاڑی ٹکرادی۔ اسکو وہ یوں بھی کہہ سکتا ہے کہ ایک نوجوان نے بارود سے بھری گاڑی ٹکرادی۔ اس کی اور بھی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

مسلم خواتین یا اسلام میں خواتین کے حقوق کے بارے میں بھی گمراہ کن رپورٹنگ کی جاتی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مسلم خواتین مردوں کی غلام ہیں اور ان کو آزادی دلانے کی اشد ضرورت ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مسلم خواتین کو انسانی حقوق نہیں ملتے اور انہیں ان کے حقوق واختیارات سے محروم رکھا جاتا ہے۔ لیکن وہ اس کی تشہیر نہیں کرتا کہ تین مسلم ملکوں پاکستان، بنگلہ دیش اور ترکی میں خواتین سربراہ حکومت رہ چکی ہیں۔ (اس سلسلے میں ایک تفصیلی مضمون الگ سے کتاب میں شامل ہے۔)

اسلام ایک خطرہ ہے:

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے آج مغرب میں اسلام کو ایک خطرہ بنا کر پیش کیا جارہا ہے اور تصویروں اور کیری کیچرس کے ذریعہ اسکی شبیہ مسخ کی جارہی ہے۔ اسلام جو کچھ ہے اور جیسا ہے اسے صحیح طور پر مغربی میڈیا پیش نہیں کررہا ہے بلکہ وہ اسلام کو اس شکل میں پیش کررہا ہے جیسا کہ وہ چاہتا ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مغربی میڈیا میں دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام مذہب کے بارے میں زیادہ مواد نظر آتا ہے۔ جان ایل اسپوزیٹو John L.

Esposito اپنی کتاب ''اسلامی خطرہ، واہمہ یا حقیقت'' میں لکھتے ہیں کہ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی اسلام مغرب کے لیے ایک خطرہ ہے؟ بقول انکے اس کا جواب مغرب کے خیالات میں پوشیدہ ہے۔ ''اگر مغربی طاقتیں دھوکہ دہی یا استحکام کے نام پر مشرق وسطی کی غیر انصاف پسند صورتحال کا دفاع جاری رکھیں گی تو اسلام ایک خطرہ ہے۔ لیکن اگر مغربی طاقتیں مشرق وسطی میں لوگوں کے اضطراب اور شکایات کے جواز کو تسلیم کرنا شروع کردیں تو مغرب اور اسلامی تحریکیں ایک ساتھ پر امن انداز میں رہ سکیں گی۔''

توقعات اور امکانات:

اس تجزیہ کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مغربی میڈیا کے ایک حلقے کی رپورٹنگ اور بعض مغربی حکومتوں کے رویے کے سبب مغرب ایک ایسا مقام بن گیا ہے جہاں اسلام کی منفی تصویر ہے اور اسلام ایک منفی مذہب ہے۔ میڈیا اسلام اور اس کے احکام کی غلط طریقے سے تشریح کرتا ہے اور اس کے تعلق سے دنیا میں غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب میڈیا اسلام کی غلط تصویر دکھاتا ہے تو عوام اسکو صحیح مان لیتے ہیں۔ اسلام کے بارے میں مغربی معاشرہ کی لاعلمی میڈیا کا کام آسان کردیتی ہے اور پھر میڈیا اسلام کی اسٹیریوٹائپ شکل پیش کرتا ہے۔ میڈیا اسلام کے بارے میں بنیاد پرست اور انتہا پسند کی اصطلاح استعمال کرتا ہے اور بعض مغربی صحافیوں کے دلوں میں موجود تعصب کے سبب ان اصطلاحات کو غلط مفہوم پہنایا جاتا ہے۔ بہر حال آج انہی گمراہ کن رپورٹوں کے نتیجے ہی میں ایک بہت بڑا طبقہ اسلام کو جاننے کی طرف مائل ہو رہا ہے اور قبول اسلام کرنے والوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ امریکا، برطانیہ اور دیگر ملکوں

میں اسلام کے بارے میں موجود غلط فہمی دور ہوگی اور حالات و واقعات اشارہ دے رہے ہیں کہ امریکا میں اسلام چند بڑے مذاہب میں سے ایک مذہب بننے جا رہا ہے۔ اور جوں جوں لوگ اسلام کی طرف مائل ہوں گے توقع ہے کہ میڈیا کے لوگ بھی اسلام کے بارے میں جاننا چاہیں گے اور ان کی رپورٹنگ کا انداز بدلے گا اور اس کے ساتھ ہی مغربی معاشرہ اسلام کی معلومات حاصل کر کے اس کے تئیں اپنے منفی رویے میں تبدیلی لائے گا۔

مغربی میڈیا اور اسلام مخالف قوتیں

موجودہ دور کا میڈیا مغرب کے کنٹرول میں ہے۔ چاہے وہ بی بی سی، سی این این، اسکائی نیوز، وی-او-اے، رائٹرس، اے ایف پی، ٹائم، نیوز ویک، انٹرنیشنل ہیرالڈ اور واشنگٹن پوسٹ جیسے ادارے ہوں یا یاہو، ebay اور Amazon جیسی طاقتور اور باا ثر انٹرنیشنل سائٹس ہوں سب مغرب کے کنٹرول میں ہیں اور ان سب کی کوریج بڑی حد تک اسلام مخالف ہے اور ان کی جانب سے تیزی سے پھیل رہے اسلام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ یہ توقع رکھنا انتہائی حماقت ہوگی کہ یہ ادارے اسلام یا مسلمانوں کے چمپئن ہوں گے یا اسلام کے تعلق سے ان کی کوریج معروضی اور صاف ستھری ہوگی۔ یہ ادارے رابرٹ میکس ویل، میخائیل گریڈ، برلوسکونی، روپرٹ مرڈوک، ہیم میئر، جیرالڈ لیوئن اور ٹیڈ ٹرنر جیسے آزاد خیال اور مادہ پرست شخصیات کے ہاتھوں میں ہیں۔

میڈیا ایک دودھاری تلوار ہے۔ اس سے اطلاعات بھی فراہم کی جاتی ہیں اور لوگوں کو گمراہ بھی کیا جاتا ہے۔ دنیا کو صحیح حقائق سے باخبر بھی کیا جاتا ہے اور غلط فہمی بھی پھیلائی جاتی ہے۔ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے ان کا جو رویہ ہے اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا اور اسلام مخالف جنگ میں میڈیا کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہے گا۔ آج مغرب میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ گیارہ ستمبر 2001 کو واشنگٹن اور نیویارک پر دہشت گردانہ حملوں کی سازش خود مغرب نے تیار کی تھی تاکہ اسلام کے

خلاف ایک نئی صلیبی جنگ کا آغاز کیا جا سکے۔ طالبان اور القاعدہ کے خلاف امریکی جنگ کے آغاز میں امریکی صدر جارج بش کی زبان پھسل گئی تھی اور انھوں نے اس جنگ کو کروسیڈ یا صلیبی جنگ قرار دیا تھا۔

نیا دشمن اسلام:

آج جو بات میڈیا کے تعلق سے پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کے زیر اثر یا اس کی ہدایت کے تحت میڈیا عالمی سطح پر اسلام مخالف جذبات کو پروان چڑھا رہا ہے۔ حال ہی میں ابوعمر الفاروق کی شائع شدہ کتاب ''اسلاموفوبیا۔ مغرب کے ذریعے خوف اور نفرت کی کہانی'' میں کہا گیا ہے کہ اسلام کے ''خوف'' سے مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ شروع کر دیا ہے اور اس میں مغربی عوام کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ وہ اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کے بجائے اسے ایک دشمن سمجھ رہے ہیں کیونکہ اسلام مغرب کے مادہ پرست اصولوں کی حمایت نہیں کرتا۔ تمام مسلمانوں اور آزاد خیال اسکالروں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ مغرب کا خفیہ ایجنڈا یہ ہے کہ تین اصل تہذیبوں کی میراث کو مکمل طور پر تباہ و برباد اور ختم کر دیا جائے۔ یہ ہیں: سوویت یونین، جو کہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ دوسرا ہے اسلام مخالف سازش ـــــ یعنی فلسطین، سعودی عرب، کویت، عمان، افغانستان اور عراق پر قبضہ اور تیسرا نشانہ چین ہے۔ اسلام مخالف جنگ کے اختتام پر چین مخالف جنگ کا آغاز ہو سکتا ہے۔

24 مئی 2003ء کو کونگو کیمپس آف دی احمدو بیلو یونیورسٹی زاریہ میں ایک لیکچر دیتے ہوئے شیخ شریف ابراہیم صالح الحسینی نے کہا تھا کہ اب مغرب ہمارے عقیدہ اور ہمارے مذہب کو تباہ کرنے اور معیشت اور خواتین کے بارے میں اسلامی

اصولوں کو بدلنے اور اسلام کی تمام میراثوں کو ختم کرنے کے لیے نکل پڑا ہے کیونکہ اسلام کی صورت مغرب کی شکل وصورت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اسی طرح معروف برطانوی مسلم دانشور محمد اسد کہتے ہیں کہ مغرب کا بنیادی خیال یہ ہے کہ جو بھی معاشرہ تشکیل پذیر ہو وہ مغربی ماڈل اور اصولوں پر آگے بڑھ کر اپنی شکل و صورت اختیار کرے۔ مغربیت کا مطلب یہ ہے کہ تمام رکاوٹوں کو توڑ دیا جائے اور دنیا کے تمام ملکوں کو مغربی سرپرستی میں متحد کر دیا جائے۔ اسی بات کو ڈاکٹر ابراہیم سلیمان یوں کہتے ہیں کہ مغرب کے ذریعہ پیش اور پرچار کیا جانے والا نیا عالمی نظام اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ سب کو مغرب کے زیر سایہ کر دیا جائے۔

مغرب کا اصل مسئلہ:

بدقسمتی سے آج جن لوگوں کے ہاتھوں میں ریڈیو، ٹی وی اور دیگر ذرائع ابلاغ ہیں وہ اسلام کو یا تو صحیح طور پر سمجھ نہیں پا رہے ہیں یا جان بوجھ کر سمجھنا نہیں چاہتے اور ان کی نظریں مغربی ماحول اور اقدار کی اس قدر عادی ہوگئی ہیں کہ ان کو اور کسی چیز میں سچائی نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بہت سے ماڈرن مسلمانوں کا رویہ مدافعانہ اور معذرت خواہانہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت دہشت گردی کے خلاف جو نام نہاد جنگ جاری ہے اس کے پیش نظر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ جو احیاء پسند اسلامی تنظیمیں ہیں وہ نام نہاد سیکولر ورلڈ آرڈر کے لیے ایک چیلنج بن گئی ہیں۔ سیموئیل ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' میں کہا ہے کہ دراصل اسلام وہ واحد تہذیب ہے جو کہ مغرب کی بقا کو شبہے میں ڈال دیتی ہے۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ مغرب کا اندرونی مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں بلکہ خود اسلام ہے۔

اسلام پر حملہ کرنے میں مغربی میڈیا کا استعمال کوئی نئی اور محدود بات نہیں ہے

بلکہ یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ ایک امریکی رائٹر پال فنڈ لے نے اپنی کتاب ''خاموشی ٹوٹ گئی۔ امریکی اسلام قبول کررہے ہیں'' میں لکھا ہے کہ دہشت گردی پر امریکیوں کا رویہ اور امریکیوں کی جانب سے پیش کی جانے والی اسلام کی فرضی تصویریں متاثر ہیں دن ڈھلے کی ان چندمنٹ کی خبروں سے جوکہ نیٹ ورک ٹیلی ویژن کے ذریعے پیش کی جاتی ہیں۔ ان خبروں میں اگر وہ تشدد سے متعلق ہوں تو مسلم اور اسلام جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح یو۔ کے ایکشن کمیٹی ان اسلامک افیئرس کے ایک سابق عہدیدار اقبال سکرانی نے برٹش ریڈیو اینڈ ٹیلی ویژن ایسوسی ایشن کی ایک کانفرنس میں لندن میں 1995 میں بولتے ہوئے کہا تھا کہ برطانوی میڈیا ہمیشہ سے اسلام اور مسلمانوں کو برا بھلا کہتا رہا ہے۔ مسلمانوں کو غیر روادار، غیر حقیقت پسند اور حس مزاح سے عاری قوم کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اسی موقعہ پر ایک آزاد ٹیلی ویژن پروڈیوسر اور انکوائری میگزین کے سابق مدیر ضیاء الدین صدر نے کہا کہ ''ٹی وی پروڈیوسرز کسی موضوع پر بولنے کے لیے جان بوجھ کر ایسے مسلمانوں کو پکڑ کر لاتے ہیں جو اس موضوع کا علم ہی نہیں رکھتے اور اس طرح یہ تاثر دیتے ہیں کہ مسلمان کچھ جانتے ہی نہیں۔'' لیکن سچ بات یہ ہے کہ موجودہ میڈیا جب ہمارا مخالف ہے تو اس سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ ہمارے پاس اتنے وسائل وذرائع نہیں ہیں کہ ہم اپنا میڈیا تیار کرسکیں۔ جب تک مسلمان اپنا متبادل اور متوازی میڈیا تیار کرنے کے اہل نہیں ہوں گے اس وقت تک مغرب ہمارے اوپر اور پوری دنیا پر اپنی خواہشات تھوپتا رہے گا۔ افغانستان اور عراق میں جاری دہشت گردی مخالف جنگ دراصل نیا عالمی نظام نافذ کرنے کی مہم کا ایک حصہ ہے جس میں خود اپنے ہی اصول وضوابط کو پاش پاش کیا جارہا ہے۔ جب تک مسلمان میڈیا کے ہتھیار سے جواب دینے کے اہل نہیں ہوں گے اس وقت تک مغرب ایپل کمپیوٹر

سے لے کر اپاچے ہیلی کا پٹر اور سٹیلائٹ ٹیلی ویژن سے لے کر شیطانی سالیوشن تک تمام قسم کے ہتھیار استعمال کرے گا۔ گیارہ ستمبر کے حملے کے بعد جب تنظیم اسلامی کانفرنس کا پہلا اجلاس ہوا تھا تو اس میں کہا گیا تھا کہ آج مسلمانوں میں عدم تحفظ کے ساتھ ساتھ عدم مردانگی کا بھی احساس ہے۔ ان میں مایوسی بھی ہے، کیونکہ بعض ممالک پر قبضے ہو چکے ہیں اور بعض پر پابندیاں لگی ہوئی ہیں۔ تیسرے گروپ کو دھمکیاں دی جارہی ہیں اور چوتھے گروپ پر دہشت گردی پھیلانے کا الزام ہے۔ آج مسلمان دوسرے ملکوں میں شکوک وشبہات کی نظروں سے دیکھے جارہے ہیں اور ان کو ان کے حقوق سے محروم کیا جارہا ہے۔

اس طرح موجودہ دور میں مغرب نے اسلام مخالف جنگ تیز کردی ہے اور اس میں میڈیا کو ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ لیکن مسلمان اس جنگ کا جواب اس ہتھیار سے دینے کے اہل نہیں ہیں۔ جب تک مسلمان اپنا طاقتور میڈیا تخلیق نہیں کریں گے اس وقت تک ان کے خلاف یہ جنگ جاری رہے گی اور وہ میڈیا کے نشانے پر رہیں گے۔

(بشکریہ بی این ڈبلیو، ہیڈ لائن نیوز۔ محمد حسن توم کے مضمون کی تلخیص)

متعصبانہ رپورٹنگ کی ایک جھلک:

چونکہ مغربی میڈیا یہودیوں کے کنٹرول میں ہے، اس لیے یہ توقع کرنا فضول ہے کہ اس میں مثبت انداز میں مسلم نمائندگی ہوگی یا مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں غیر متعصبانہ رپورٹنگ ہوگی، حالانکہ میڈیا میں غیر متعصب صحافیوں کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ بیشتر ایسے ہیں جو اسلام مخالف ذہنیت کے تابع ہیں۔ اسی لیے ان کی مسلم رپورٹنگ میں فطری

طور پر اسلام مخالفت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ہم یہاں دو مثالیں پیش کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ مغربی میڈیا میں کچھ لوگ کس طرح کی رپورٹنگ کرتے ہیں اور لوگوں کو کیسے گمراہ کرتے اور مسلمانوں کی تذلیل وتوہین کرتے ہیں۔

روزہ رکھنے والے مسلمان کاکروچ ہیں:

اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں متعصب رپورٹنگ کا ایک انداز یہ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ ایک ریڈیو سے وابستہ صحافی نیل بورٹز Neal Boortz مسلمانوں سے اس لیے نفرت کرتا ہے کہ وہ ماہ رمضان میں دن میں روزہ رکھتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ مسلمان رمضان میں دن میں روزہ رکھتے ہیں کھاتے پیتے نہیں ہیں صرف رات میں کھاتے پیتے ہیں، اس لیے وہ ''مثل کاکروچ ہیں۔''

نیل بورٹز کا فلیگ شپ ریڈیو اسٹیشن ڈبلیو ایس بی اٹلانٹا میں ہے۔ اپنے ایک حالیہ ریڈیو شو میں وہ برطانیہ کی نیشنل ہیلتھ سروس پر ایک رپورٹ پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ چند ہفتے قبل نیشنل ہیلتھ سروس میں مسلم ڈاکٹر کام کر رہے تھے جو کہ لندن والوں کو دھماکے سے اڑانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی کار گلاسگو ایئر پورٹ پر ٹکرا دی۔ (ڈاکٹر محمد حنیف کے واقعہ کو ذہن میں رکھیں) وہ پکڑے گئے، کار بم دھماکہ نہیں ہو سکا۔ وہ آگے کہتا ہے کہ لندن کے ایک اسپتال میں ڈاکٹروں اور دوسرے عملہ کو انھوں نے ہدایت دی کہ وہ آئندہ ماہ ورکنگ لنچ نہ کریں۔ ورکنگ لنچ سے مراد وہ ہے جو آپ اپنے گھر سے دوپہر کا کھانا لاتے ہیں اور اپنی میز پر کھاتے ہیں۔ لہٰذا آئندہ ماہ آپ اپنی میز پر ورکنگ لنچ نہ کریں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ رمضان کا مہینہ ہوگا، اور اگر آپ کے ساتھ کام کرنے والے مسلمان یہ دیکھیں گے کہ آپ لنچ کر رہے ہیں تو ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ

میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان رمضان کے دوران دن میں کھاتے پیتے نہیں ہیں۔ وہ دن میں روزہ رکھتے ہیں اور رات میں کھاتے ہیں۔ ''بالکل کاکروچوں کی مانند۔'' خیال رہے کہ Neal Boortz کو اس کے ریڈیو شو کے لیے امریکا میں متعدد ایوارڈ مل چکے ہیں۔

بارک حسین ابامہ: ''مسلمان ہمیشہ مسلمان ہی رہتا ہے''

امریکا کی خاتون صحافی ڈیبی شلوسیل Debbie Schlussel نے گذشتہ سال بارک ابامہ پر ایک مضمون قلمبند کیا اور اپنی ویب سائٹ Bio پر پوسٹ کیا جس میں انھوں نے بارک ابامہ کی صدارتی امیدواری کی اس وجہ سے مخالفت کی کہ ان کا خاندان مسلم بیک گراونڈ رکھتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ چونکہ بارک ابامہ کا درمیانی نام حسین ہے اور ان کے باپ مسلم نسل سے تھے، اس لیے ان کی وفاداری پر سوالیہ نشان لگ رہا ہے۔ وہ اس ''اصول'' کو پیش کرتی ہیں کہ ''مسلمان ہمیشہ مسلمان ہی رہتا ہے'' اور اس کی بنیاد پر ابامہ کی مخالفت کرتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ابامہ کی ماں کا دوسرا شوہر ایک انڈونیشیائی تھا جسے وہ ''مثل مسلم'' کہتی ہیں۔ وہ Scott Turow کے ایک مضمون کا حوالہ دیتی ہیں جو کہ Salon. com پر مارچ 2004 میں پوسٹ کیا گیا تھا۔ لیکن وہ اس مضمون سے صرف اپنے مطلب کی باتیں منتخب کرتی ہیں اور ان حقائق کو نظر انداز کر دیتی ہیں جو ان کے نظریے کے خلاف ہیں۔ وہ اس کا ذکر تو کرتی ہیں کہ انڈونیشیا میں سکونت کے زمانے میں ان کا داخلہ ایک مسلم اسکول میں ہوا تھا لیکن یہ نہیں بتاتیں کہ اس دوران ان کو ایک کیتھولک اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا۔ شلوسیل ابامہ کے اس بیان کو بھی لائق اعتنا نہیں سمجھتیں کہ ان کے باپ اور سوتیلے باپ عملاً مسلمان نہیں تھے۔ (ان کا یہ بیان

شکاگو سن ٹائمز میں 5 ر اپریل 2004 کو شائع ہوا تھا۔) اوبامہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کے والد Agnostic تھے یعنی وہ ''لا ادریہ'' مسلک پر تھے۔ (ایسے لوگوں کا عقیدہ ہوتا ہے کہ خدا ہے یا نہیں ہمیں نہیں معلوم) ان کے دادا مسلمان اور ماں عیسائی تھی، جب وہ چھ سال کے تھے تو ان کے والدین میں طلاق ہوگئی اور وہ اپنی ماں کے پاس چلے گئے۔ ان کے سوتیلے باپ عملی مسلمان نہیں تھے۔ انڈونیشیا میں وہ دس سال کی عمر تک رہے اور ایک رومن کیتھولک اسکول میں پڑھتے رہے۔

شلوسیل کا دعویٰ ہے کہ ''ریڈیکل اسلام اور اسلامی دہشت گردی'' کے موضوع پر ان کو مہارت حاصل ہے اور ان کا آن لائن فین کلب دوسرا بڑا فین کلب ہے۔ ان کے تعصب کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ کہتی ہیں کہ بارک اوبامہ کا پورا نام بارک حسین اوبامہ ہے اور حسین علی کے بیٹے یعنی حسین ابن علی ہیں اور یہ اوبامہ کا درمیانی نام ہے۔ ان کا پورا نام ان کے کینیائی باپ سینئر بارک حسین اوبامہ کے نام پر ہے۔ وہ دلیل دیتی ہیں کہ عرب کلچر اور عرب اسلامی قانون میں اگر کسی کا باپ مسلم ہے تو وہ بھی مسلم ہے۔ اور مسلمان ہمیشہ مسلمان ہی رہتا ہے۔ ان کا تعلق انڈونیشیا سے ہے اور وہاں مسلمانوں کی آبادی دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔

شلوسیل ان بودی دلیلوں کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ بارک حسین اوبامہ گرچہ خود کو عیسائی بتاتے ہیں لیکن ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم اس وقت دہشت گردی مخالف جنگ میں اسلام کے خلاف لڑ رہے ہیں ایسے میں بارک حسین اوبامہ کو امریکی صدر کے طور پر کیسے منتخب کر سکتے ہیں۔ البتہ وہ انہیں نائب صدر کے طور پر ضرور قبول ہیں۔

میڈیا اور اسلاموفوبیا

مغربی میڈیا میں موجود اسلام مخالف عناصر نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کے لیے متعدد ہتھکنڈے اپنا رکھے ہیں۔ ان میں سے ایک ہتھکنڈے کا نام ہے ''اسلاموفوبیا''۔ یہ ایک لفظی ترکیب ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے تئیں غیر حقیقی خوف، نفرت اور تعصب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ عناصر اپنی رپورٹوں، خبروں، تجزیوں، تبصروں، اور مضامین کی مدد سے دنیا کو اسلام اور مسلمانوں سے خوفزدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تشدد کے کسی بھی واقعہ کے بعد وہ یہ بتانے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے کہ امن عالم کو اسلام اور مسلمانوں سے خطرہ ہے۔ اس کے لیے متعدد فرضی اور من گھڑت تراکیب اور اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ نائن الیون کے بعد یہ مہم مزید تیز ہوگئی ہے اور اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کی آڑ میں دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک خطرہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ خبریں اور رپورٹیں اس انداز سے بنائی اور تراشی جاتی ہیں کہ جیسے پوری دنیا اسلام کی نازل کردہ تباہی کی زد پر ہے۔ اسلامی ملکوں کے واقعات کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے جیسے مسلمان وحشی جنونی اور درندے ہوں اور اگر ان وحشیوں اور درندوں سے امن عالم کو بچانا ہے تو ان کے خلاف لوگوں کو اٹھ کھڑا ہونا ہوگا۔

امریکا پر گیارہ ستمبر کے حملوں سے قبل بھی مغربی میڈیا کے یہ عناصر اسلاموفوبیا میں گرفتار تھے اور آج بھی ہیں۔ وہ اپنی رپورٹنگ سے لوگوں کے دلوں میں پہلے

سے موجود تعصب کو اور ہوا دیتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں سے ناواقف لوگ ان رپورٹوں کے زیر اثر اسلام دشمنی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ میڈیا پر حاوی طاقتور افراد اس کے لیے بہت ہی عیاری اور چالاکی سے کام لیتے ہیں اور یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے کہ ان کی نیتوں میں کوئی فتور پوشیدہ ہے۔

خوف و دہشت پیدا کرنے کی کوشش:

اسلام اور مغرب کے بارے میں اپنی تصنیف ''کورنگ اسلام'' (Covering Islam) میں ایڈورڈ سعید بھی اس جانب اشارہ کرتے ہیں اور بی بی سی عربی سروس کے سابق ایڈیٹر اور اسکرپٹ رائٹر (Malise Ruthven) ملائس روتھوین بھی مغربی میڈیا کے اسلاموفوبیا کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون ''اسلام ان دی میڈیا'' میں میڈیا کے اسلاموفوبیا میں مبتلا ہونے کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں۔ یہ مضمون Hastings Donnan کی ترتیب کردہ کتاب '' Interpreting Islam '' میں شامل ہے۔ وہ ایک اقتباس کا حوالہ دیتے ہیں جو کہ برطانوی روزنامہ Daily Mail کے 28 ستمبر 1997 کے ایڈیشن میں شائع ہوا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ سعودی عرب میں کسی موت کے سزایافتہ قیدی کی فوج کی موجودگی میں گردن اڑائی جاتی ہے۔ ہزاروں تماشائی جمع ہو جاتے ہیں۔ جلاد ایک سفید ٹوپی پہن کر آتا ہے جس پر سونے چاندی کی کشیدہ کاری ہوتی ہے۔ ایک جج آتا ہے جو قرآن کی آیات تلاوت کرتا ہے جس سے قیدی کے ٹارچر میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسے اس وقت تک پتہ نہیں ہوتا ہے کہ اس کا آخری دن آ گیا ہے جب تک کہ جیل کے گارڈ اس کے سیل میں گھس نہیں جاتے۔ بالآخر اسے گھسیٹ کر لایا جاتا ہے اور

جبراً گردن جھکا دی جاتی ہے۔ جلاد اپنی چار فٹ کی تلوار سے ایک ہی جھٹکے میں اس کی گردن اڑا دیتا ہے۔

روتھوین کا سوال ہے کہ کیا یہ اسلاموفوبیا نہیں ہے اور کیا اس رپورٹنگ کے ذریعہ لوگوں کو دہشت زدہ نہیں کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی آف سسکس کے سابق وائس چانسلر اور ایک کمیشن کے سربراہ گورڈن کانوے Gordan Conway کہتے ہیں کہ اسلاموفوبیا اسلام اور مسلمانوں کے تئیں خوف و دہشت اور نفرت پھیلانے کا ایک کامیاب شارٹ ہینڈ ہے۔ وہ رنی میڈ ٹرسٹ Runny mede Trust 1971 کی رپورٹ میں کہتے ہیں کہ صحافیوں اور ایڈیٹروں کو اس کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے کہ کیا وہ اسلام اور مسلمانوں کے متبادل کے طور پر عیسائیت یا عیسائی اور یہودیت یا یہودی کا استعمال کریں گے۔ یعنی اگر معاملہ عیسائیوں اور یہودیوں کا ہوتو کیا اس وقت بھی وہ اسی زبان میں رپورٹنگ کریں گے؟ ''میڈیا کوریج'' کے عنوان سے کمیشن کی رپورٹ میں سوال کیا گیا ہے کہ کیا ایڈیٹر حضرات اس وقت بھی ایسے اقتباسات کو شائع کرنے یا نشر کرنے کی اجازت دیں گے جب معاملہ عیسائیوں اور یہودیوں کا ہو اور کیا کسی واقعہ کی آڑ میں تمام یہودیوں اور عیسائیوں کو بھی معتوب کیا جائے گا۔ کمیشن کا خیال ہے کہ اگر اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب سے متعلق لوگوں یا واقعات کی رپورٹنگ کرنی ہوتو انداز بدلا ہوا ہوگا۔ روزنامہ اخبار ڈیلی ایکسپریس کے جنوری 1995 کے ایک ایڈیشن میں عراق سے متعلق ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا مفہوم ہے کہ مسلمان جہاں بھی ہیں خود کو تباہی و بربادی کے متبادل کے طور پر پیش کر رہے ہیں (اشارہ ان عراقیوں کی طرف ہے جن کے بارے میں رپورٹ دی گئی تھی کہ وہ سرعام چوروں اور بھگوڑے فوجیوں کے کان اور ہاتھ کاٹ رہے ہیں) انھوں نے مجرموں کے سر قلم کر دیے، عیاشی میں مبتلا عورتوں کو رجم کر دیا، چادر اوڑھنے سے انکار

کرنے والی خواتین کے چہروں پر تیزاب پھینک دیا، جوان لڑکیوں کے اعضاء کاٹ دیے اور ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہمیں ان کے اور ان کے مذہب کے ساتھ عزت سے پیش آنا ہے۔ اور ہم ایسا ہی کریں گے کیونکہ نئے سیاسی حالات ہم سے اسی کا تقاضہ کرتے ہیں۔

اس مضمون کے خلاف پریس شکایت کمیشن میں شکایت کی گئی لیکن یہ شکایت مسترد کردی گئی۔ کمیشن نے یہ دلیل دی کہ یہ مضمون نگار کے ذاتی خیالات ہیں اور اسے اس کے اپنے نقطۂ نظر سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس مضمون کو تعصب پر مبنی ماننے سے انکار کردیا گیا اور کہا گیا کہ اس میں مسلمانوں کے بارے میں جو کہا گیا ہے وہ نادرست، گمراہ کن اور مسخ شدہ نہیں ہے۔ کمیشن کے ذریعے شکایت مسترد کئے جانے کے باوجود شکایت کنندہ اپنی بات پر قائم تھا اور اس نے دلیل دی کہ اگر عیسائیوں کے تعلق سے ایسا ہتک آمیز اقتباس شائع ہوجائے تو فوری طور پر ہتک عزت قانون کے تحت کاروائی ہوجائے گی۔ Runnymede Trust نے اپنی رپورٹ میں مزید کہا کہ اگر یہودی عقیدہ سے متعلق ایسی زبان استعمال کی گئی ہوتی تو اسے نہ صرف یہودی مخالف قرار دیا گیا ہوتا بلکہ اسے نسلی قانون کی خلاف ورزی کرنے والا ایک جرم مانا گیا ہوتا۔ مضمون نگار نے بعض مسلم ممالک میں سزاؤں کے تئیں نہ صرف یہ کہ اپنے نفرت انگیز خیالات ظاہر کئے بلکہ اس نے اپنی لفاظی کی مدد سے اسے وسیع مفہوم میں پیش کیا اور اسے تمام مسلمانوں اور اسلامی عقائد پر منطبق کیا۔ Covering Islam میں ایڈورڈ سعید بھی ایسے اقتباسات کے حوالوں سے بتاتے ہیں کہ کس طرح اسلام اور مسلمانوں کی امیج کو داغدار کیا جاتا ہے اور ان کے تعلق سے خوف، دہشت اور نفرت کا ماحول پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایران میں انقلاب کے دوران پھانسی اور زیادتی کے جو واقعات ہوئے تھے، ان کو اسلام

سے جوڑا گیا اور تجزیوں میں اسے ''ہم بمقابلہ وہ'' کی ناپسندیدہ اصطلاح کی شکل میں پیش کیا گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ مغربی ملکوں میں ایسی زیادتیوں اور بے ضابطگیوں کا اطلاق اکثریت کے مذہب پر نہیں کیا جاتا۔ سعودی عرب میں سزائے موت سے متعلق رپورٹنگ کا جو اقتباس پیش کیا گیا ہے، اس کے حوالے سے ملائس روتھوین کہتے ہیں کہ اس میں کہا گیا ہے کہ قرآن کی آیات تلاوت کرنے سے قیدی کی اذیت میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن کیا مذکورہ اخبار امریکا میں سزائے موت کے وقت پادری کے ذریعہ بائبل کی تلاوت کا ذکر بھی کرے گا اور اسی انداز میں کرے گا اور کیا وہ بائبل خوانی کو بھی قیدی کی اذیت میں اضافہ کا سبب قرار دے گا؟ Runnymede Trust نے اپنی رپورٹ میں مثالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ مغربی میڈیا کے تعلق سے مسلمانوں کی شکایات جائز ہیں۔ بالخصوص جب جنس Genderاور تشدد کی رپورٹنگ ہوتی ہے تو اسکو دوسرا رنگ دیدیا جاتا ہے۔ رپورٹ میں ڈیلی میرر کی ایک منفی سرخی پیش کی گئی ہے کہ ''مسلم باغیوں نے ایک ہی رات میں 193افراد کا قتل کردیا۔'' لیکن رپورٹ میں اس جانب ہلکا سا بھی اشارہ نہیں ہے کہ جن کا قتل کیا گیا وہ بھی مسلمان تھے۔ رپورٹ کے مطابق جب السٹر میں ظلم ہوتا ہے تو صحافی اور کیمرہ مین مستقل طور پر ایسے پادری کی تصویر بھی پہلو بہ پہلو شائع کرتے ہیں جو اس جرم کی مذمت کررہا ہوتا ہے۔ لیکن جب مسلمانوں کی طرف سے ایسا تشدد ہوتا ہے تو وہ اس واقعہ کی مذمت کرتے ہوئے کسی مسلم لیڈر یا عالم کو نہیں دکھاتے۔ حالانکہ اگر آپ عربی اخبارات اٹھا کر دیکھیں تو مسلمانوں کی جانب سے ان واقعات کی متواتر مذمت کی جاتی ہے۔

مکروفریب پر مبنی رپورٹنگ:

جب گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگن پر دہشت گردانہ حملے کئے گئے تو

فوری طور پر اس کا الزام القاعدہ پر عائد کر دیا گیا۔ پوری دنیا کے مسلمانوں کے خلاف نفرت کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور مسلمانوں اور اسلام کی طرف اشاروں کنایوں اور بعض اوقات واضح انداز میں یہ کہا گیا کہ وہ ہمارے دشمن ہیں، ہماری آزادی اور ہماری قدروں کے دشمن ہیں اگر ہمیں اپنے ملک کی اور خود اپنی آزادی عزیز ہے اور اپنی آنے والی نسلوں کا تحفظ مطلوب ہے تو اس دشمن کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا ہوگا اور اسے شکست دینی ہوگی۔ پھر ان واقعات کی آڑ میں افغانستان پر حملہ کر کے اس ملک کو تہس نہس کر دیا گیا اور دنیا بھر میں القاعدہ کے خلاف اور داڑھی، ٹوپی، کرتا، پگڑی اور اسلامی شعائر کے خلاف ایک ماحول بنا دیا گیا جس کے نتیجے میں کسی بھی باریش شخص کو دہشت گرد کہہ دینا بہت آسان ہو گیا۔ اسی طرح عراق میں وسیع تباہی کے ہتھیاروں کی موجودگی کا زور شور سے ڈھنڈورا پیٹا گیا اور کہا گیا کہ اگر ان ہتھیاروں کو تلاش کر کے تباہ نہ کیا گیا تو دنیا کو اسلامی خطرے سے نجات نہیں مل پائے گی۔ پہلے ایک طویل عرصے تک ان ہتھیاروں کی، جو کہ موجود ہی نہیں تھے، ناکام تلاش کی گئی اور پھر اسی بہانے سے عراق پر حملہ کر دیا گیا۔ حملے کے بعد بھی وسیع تباہی کے ہتھیار نہ مل سکے۔ بلکہ حملہ کر کے عراق میں وسیع تباہی پھیلا دی گئی۔ ان دونوں معاملات کی آڑ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غیر حقیقی خوف و دہشت کا پروپیگنڈہ کیا گیا اور پھر ان کے خلاف نفرت آمیز ماحول تیار کیا گیا۔ یہ مہم اس وقت تک ہرگز کامیاب نہ ہوتی اگر میڈیا نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لیا ہوتا۔

گمراہ کرنے کی کوشش:

اسلاموفوبیا کے شکار میڈیا میں اس قسم کی سرخیاں لگائی جاتی ہیں۔ یہ دھماکہ کس

نے کیا ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے پیٹرن بتاتے ہیں کہ اس میں القاعدہ اور طالبان کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ غیر ملکی سیاحوں پر حملوں کی ذمہ داری ابھی تک کسی دہشت گرد گروپ نے قبول نہیں کی ہے لیکن ہمارے نامہ نگار نے ذرائع کے حوالے سے بتایا ہے کہ ان حملوں میں اسلامی دہشت گرد ملوث ہو سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان دہشت گردوں کے بارے میں جن کے نام مسلمانوں جیسے ہوں، یہ کہا جائے کہ وہ انتہائی خطرناک بھی ہیں اور نفسیاتی مریض بھی۔ اسامہ بن لادن، ایمن الظواہری، یہاں تک کہ صدام حسین اور دوسروں کے بارے میں یہی طریقہ کار اختیار کیا گیا۔ لیکن اگر کسی ناپسندیدہ واقعہ میں کوئی مغربی حکومت یا فوجی ملوث ہوں تو ان کو دلیرانہ کارروائی قرار دیا جاتا ہے۔ افغانستان اور عراق پر حملوں کے دوران متعدد نامہ نگاروں نے اتحادی افواج کی ''فوجی صلاحیتوں'' کی خوب مدح سرائی کی اور کہا کہ ان کا نشانہ اچوک ہے اور وہ اپنے ہدف کو حاصل کرنے میں کبھی ناکام نہیں ہوتے۔

جب جنوری 1993 میں ڈیوڈ کوریش کی جماعت پر امریکی فوجیوں نے حملہ کیا اور ڈیڑھ سو لوگوں کو گولیوں سے بھون دیا تو مغربی خبر رساں ایجنسیوں نے اس کارروائی کو امریکی فوج کا کارنامہ قرار دیا۔ اور اسکی توجیہ اس طرح کی کہ ہر سماج میں ایسے لوگ ہیں جو معاشرہ سے الگ تھلگ رہتے ہیں اور ذہنی و نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ ان پر ماہرین کو توجہ دینی چاہیے۔ امریکا، برطانیہ اور دیگر مغربی ملکوں سے قتل و خوں ریزی کی خبریں مسلسل آتی ہیں۔ کبھی کوئی اسٹوڈنٹ اپنی ہی کلاس کے ساتھیوں کو گولیوں سے بھون دیتا ہے اور کبھی کوئی جنونی بندوق لیکر راہ گیروں کو قتل کر دیتا ہے لیکن نہ تو ان کے خاندان کے لوگوں کو پکڑا جاتا ہے اور نہ ہی ایسے مجرموں کی کارروائیوں کا کوئی تجزیہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسی کارروائیوں میں کوئی مسلم

اسٹوڈنٹ ملوث ہو یا کوئی مسلمان جنون میں آ کر اور ذاتی رنجش کے سبب کچھ لوگوں کا قتل کر دے تو فوری طور پر دنیا بھر کے مسلمانوں کی نفسیات کا جائزہ شروع کر دیا جاتا ہے اور ان جرائم کی جڑیں اسلام، قرآن اور اسلامی تعلیمات میں تلاش کی جاتی ہیں۔

اسی طرح ایران، فلسطین اور دیگر اسلامی ملکوں کے بارے میں رپورٹنگ کی جاتی ہے۔ یہ لوگ ایک طرف جمہوری قدروں کی تشہیر کرتے ہیں اور ڈیموکریٹک اندازِ حکمرانی کی حمایت کرتے ہیں لیکن جب فلسطین میں حماس کے لوگ ڈیموکریٹک انداز میں برسر اقتدار آتے ہیں تو یہ بھی مغربی رہنماؤں کے نقش قدم پر چل پڑتے ہیں اور جمہوری انداز میں منتخب حکومت کو قیام امن کے لیے خطرہ قرار دیتے ہیں۔

ٹائم بم تیار ہو رہے ہیں:

گیارہ ستمبر کے بعد امریکا اور برطانیہ میں جس طرح اسلاموفوبیا پروان چڑھا ہے وہ ٹائم بم بنتا جا رہا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر یہ رجحان جاری رہا تو ایک دن مسلمانوں کے ذریعہ شدید ردعمل کا اظہار ہوگا اور صورت حال انتہائی خطرناک ہو جائے گی۔ ''کمیشن ان برٹش مسلمس اینڈ اسلاموفوبیا'' نے اپنی رپورٹ میں اس خطرے کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ حکومت کے ادارے برطانیہ میں مسلمانوں کے تحفظ میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ کمیشن کے چیئرمین اور اسٹیفن لارنس انکوائری کے سابق مشیر ڈاکٹر رچرڈ اسٹون نے اپنی رپورٹ میں انتباہ دیا اور متعدد سفارشات پیش کیں لیکن ان کو نظر انداز کر دیا گیا۔ کمیشن کے چیئرمین عبدالجلیل ساجد کا خیال ہے کہ برطانیہ میں متعدد حکومتی ادارے بھی اسلاموفوبیا میں گرفتار ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد پولیس مسلمانوں کو ہراساں کرنے لگی ہے۔ یہاں تک کہ برطانوی مسلمانوں کی ایک نمائندہ اور معزز شخصیت لارڈ احمد کو پولیس نے دوبار روکا۔ ادھر مسلم

کونسل آف برٹش کے سکریٹری جنرل اقبال سکرانی کہتے ہیں کہ پولیس اتھارٹی کی جانب سے ایشیائیوں کو روکنے اور تلاشی لینے کے واقعات میں 41 فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔اس کے علاوہ میڈیا میں مسلم مخالف پروپیگنڈہ بھی کافی تیز ہوگیا ہے۔انہوں نے بھی حکومتی اداروں کے اسلاموفوبیا میں گرفتار ہونے کی بات کہی ہے۔

مغربی کتابیں اسلام مخالف مواد سے پُر ہیں:

ہاشی قریشی ڈنمارک کے ایک نسل پرستی مخالف کارکن اور انسانی حقوق کے علمبردار ہیں۔وہ میڈیا اور اقلیتوں سے متعلق ایک سہ ماہی جریدہ ''میڈیا واچ'' کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ پہلے پاکستان ہجرت کی پھر ڈنمارک چلے گئے، انھوں نے مغربی ملکوں میں تعلیم پائی ہے۔وہ ڈنمارک اور دوسرے ممالک کی متعدد تنظیموں کے رکن بھی ہیں۔انھوں نے اسلاموفوبیا پر کافی کام کیا ہے اور وہ معاشرے میں میڈیا کی اہمیت کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ مغربی تاریخ اسلام مخالف لٹریچر سے بھری پڑی ہے۔کتابوں میں اسلام کی منفی کوریج ہے اور میڈیا سے وابستہ لوگ لاعلمی اور تعصب کی کارفرمائی کے تحت اسلام مخالف جذبات رکھتے ہیں۔

امریکی اسکالر اسٹیون باف مین نے اپنی کتاب ''اسلام اینڈ ڈیموکریسی'' میں لکھا ہے کہ ''صحافیوں کی دلچسپی اچھی خبروں میں نہیں بلکہ ان خبروں میں ہوتی ہے جن کو توڑ امروڑا گیا ہو۔میڈیا طاقتور گروپوں کے ہاتھ میں ہے جن کو اپنا پروڈکٹ بیچنے کے لیے ٹکراؤ، گروپ بندی، اور گمراہ کن اطلاعات درکار ہوتی ہیں۔'' دوسری قسم کا میڈیا روپرٹ مرڈوک جیسے نظریہ سازوں کے ہاتھ میں ہے جو اسلام اور مسلمانوں کو مغربی طرز زندگی اور جمہوریت کے لیے خطرہ قرار دیتے ہیں۔ جبکہ

تیسری قسم کا میڈیا معروضی سنجیدہ اور غیر جانبدارانہ انداز میں سماجی مسائل کو اٹھاتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے جب اسلام اور مسلمانوں کی بات آتی ہے تو غیر جانبدار صحافی بھی تعصب کے شکار ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بی بی سی نیوز بھی اسلامی دہشت گردی، اسلامی جنگجو اور جہادی جیسے الفاظ کو فیشن کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ہاشی قریشی اپنے ایک مضمون میں جو کہ انہوں نے ایک سمینار میں پڑھا تھا، ایک مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ 2006 کے کرسمس سے قبل بی بی سی ورلڈ نے ''انسائڈ دی طالبان'' کے عنوان سے ایک پروگرام کیا۔ پروگرام کے آخر میں رپورٹر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ'' افغانستان میں طالبان لڑاکوں کے لیے وقت 1994 سے ہی نہیں ٹھہرا ہے جب انھوں نے اقتدار پر قبضہ کیا بلکہ 1400 سال قبل سے ہی ٹھہرا ہوا ہے جب ان کے مذہب کا آغاز ہوا تھا۔''

اسلاموفوبیا پر سروے اور تحقیق:

مغربی میڈیا کے اسلاموفوبیا اور اسلام مخالف کردار کا تجزیہ مغرب میں بھی ہوتا رہا ہے اور اس کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیا جاتا رہا ہے کہ میڈیا اسلام مخالف جذبات کیوں رکھتا ہے۔ نائن الیون کے بعد اس سلسلہ میں تحقیقات تیز ہوگئی ہے اور جو ریسرچ کی گئی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں!

- نومبر 2003 میں یوروپین ڈے آف میڈیا مانیٹرنگ کی جانب سے Utrecht یونیورسٹی کے Jessikater wall کی تحقیق۔
- 2002 میں یونیورسٹی آف اسٹافورڈ شائر کے ڈاکٹر ایلیز بتھ پول کی ریسرچ جو رپورٹنگ اسلام کے نام سے شائع ہوئی۔
- 2003 میں یوروپین مانیٹرنگ سنٹر کے زیر اہتمام سروے برائے اسلاموفوبیا۔

- 1996 اور 2004 میں اسلاموفوبیا پر Runnymede Trust کی رپورٹ۔
- 2001 میں ڈنمارک کے این جی او فیئر پلے کی رپورٹ بہ عنوان ''اسلام مغربی میڈیا میں۔''
- 2004 میں کمیشن ان برٹش مسلمس کی رپورٹ بعنوان ''اسلاموفوبیا۔ ایشوز، چیلنجز اینڈ ایکشن۔''
- 2005 میں نیٹ ورک آف یوروپین فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ڈاکٹر وانلابی جارج کا مطالعہ۔
- 2006 میں ای-یو-ایم-سی کی تحقیق بعنوان ''یوروپی یونین میں مسلمان —— تفریق اور اسلاموفوبیا۔''

ان تحقیقی رپورٹوں اور جائزوں میں بتایا گیا ہے کہ مغربی میڈیا مسلمانوں کو عام طور پر غیر ملکی، غیر حقیقت پسند، بد اخلاق، خطرناک، انتہا پسند اور جنونی کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ایسی رپورٹوں کے نتیجے میں مسلمانوں کا اس معاشرے سے ٹکراؤ ہوتا ہے جہاں وہ سکونت پذیر ہوں اور پھر ان کے خلاف ایک ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔

ہاشی قریشی کہتے ہیں کہ میں نے اس موضوع پر معلومات حاصل کرنے کے لیے جب گوگل سرچ مشین پر رسائی حاصل کی اور ''مغربی میڈیا میں اسلام'' ٹائپ کیا تو نو سکنڈ کے اندر 8.36000 مضامین میرے سامنے آ گئے۔ جبکہ ''مغربی میڈیا۔ تعصب اور اسلام'' کے عنوان سے 16800 مضامین میرے استقبال کو موجود تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں ان کے میگزین نے اسلام اور مغربی میڈیا سے متعلق اخبارات اور ٹی وی نیوز کوریج کے بیس ہزار تراشے اکٹھا کئے ہیں۔ جن میں ڈنمارک، یوروپی یونین اور دیگر مغربی ملکوں کا میڈیا شامل ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق اسلام کے تعلق سے مغربی میڈیا کی 65 فیصد کوریج منفی ہے۔ وہ

بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ سوویت یونین کے بکھراؤ کے بعد مغرب اور مغربی میڈیا نے اسلام کی شکل میں اپنا ایک نیا دشمن کھڑا کرلیا ہے۔

منفی کوریج کے اثرات:

مسلم کونسل آف برٹش کے ترجمان عنایت بنگلہ والا نے نومبر 2004 میں دی نیوز انٹرنیشنل یو کے کو انٹرویو دیتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں میڈیا کی منفی کوریج کے اثرات بد کی طرف اشارہ کیا تھا اور کہا تھا ''میڈیا کوریج کے نتیجے میں مسلمان خود کو محصور پاتے ہیں۔ نہ صرف ان کے عقیدہ پر حملہ ہورہا ہے بلکہ اسلام کے قلب پر حاوی ہونے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ خیال پختہ ہوتا جارہا ہے کہ مغربی میڈیا مسلمانوں کی تضحیک وتذلیل کے لیے میدان میں کود پڑا ہے۔''

اگر مغربی میڈیا کے اسلاموفوبیا کے اسباب کی تلاش کریں تو سب سے بڑا سبب اسلام کے تعلق سے مغرب میں تاریخی تعصب ہے۔ اس کے علاوہ نظریاتی بالادستی، نسل پرستی پر مرکوز تعلیمی نظام اور غیر یوروپی ثقافت، دیگر مذاہب اور طرز زندگی سے لاعلمی، ایڈیٹروں کی جانب سے جلد از جلد رپورٹ فائل کرنے کا دباؤ، مالکوں کا معاشی مفاد اور زبردست مقابلہ آرائی، سماجی تبادلہ خیال کے دوران ثقافتی انانیت کی موجودگی، میڈیا متاثرین کی جانب سے فوری طور پر مثبت ردعمل کا فقدان اور مسلم کمیونٹیز کے مابین رابطے کی کمی اور اس قسم کے دیگر معاملات کو بھی اسلام مخالف جذبات کے پروان چڑھنے میں اہم ذرائع کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

❀❀❀

ریڈیکل اسلام کی آڑ میں

اصل اسلام نشانہ

میڈیا کے ایک با اثر طبقہ کے رحم و کرم سے آج عالمی سطح پر اسلام کو دو شکلوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک ریڈیکل اسلام یا انقلابی اسلام کی شکل میں اور دوسرا ماڈریٹ یا اعتدال پسند اسلام کی شکل میں۔ مغربی دانشوروں اور میڈیا کے بعض حلقوں میں جب بھی اسلام کی بات آتی ہے تو ریڈیکل اسلام کا بھی ذکر ضرور ہوتا ہے۔ صرف مغربی ممالک ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان میں بھی میڈیا ادارے اور ان میں بیٹھے ہوئے طاقتور افراد جب بھی دہشت گردی پر بحث کرتے ہیں تو ''اسلامی دہشت گردی'' پر کرتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ بن لادن جیسے انتہا پسندوں کے بہانے ریڈیکل اسلام پر اظہار خیال کرنے لگتے ہیں۔ پھر اسلام کو نشانہ بنانے لگتے ہیں۔

اگر ہم اصولی طور پر دیکھیں تو اسلام خود ایک انقلاب ہے اور جب یہ دنیا میں آیا تو رفتہ رفتہ اس نے نہ صرف سرزمین عرب پر ایک انقلاب برپا کر دیا بلکہ اس کی حدود سے نکل کر دیگر خطوں اور ملکوں میں بھی ایک انقلاب بپا کر دیا۔ لیکن یہ خونی انقلاب نہیں تھا، یہ تلوار کے زور پر نہیں پھیلا اور نہ ہی لوگوں کو زبردستی اسلام میں داخل کیا گیا۔ اسلام تو انسانیت، محبت اور امن و شانتی کا پیغام لے کر آیا۔ اس نے اپنے اصولوں اور قدروں سے تمام تر شعبہ ہائے زندگی کو ایک نئی شکل دے دی اور عدل

وانصاف کی حکمرانی قائم کی۔ لیکن آج لفظ انقلاب کو جب اسلامی تناظر میں بولا جاتا ہے تو یہی لفظ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ جب انقلابی اسلام کی بات کی جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام تشدد کا حامی ہے، دہشت گردی کا طرفدار ہے اور شدت پسندی وانتہا پسندی کو ہوا دیتا ہے۔ آج کا میڈیا اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری سمیت ان تمام لوگوں اور تنظیموں کو ریڈیکل کہہ کر ان کی ایک منفی شبیہ پیش کرتا ہے جو امریکا، برطانیہ اور اسرائیل سمیت دیگر مغربی ملکوں کی ناانصافیوں کے خلاف کمربستہ ہیں۔ اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کے اسلام کی حمایت کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور مسلمانوں کی اکثریت ان کے اصول و نظریات کی مخالف ہے۔ مسلمان تشدد، قتل وخوں ریزی اور خودکش بمباری میں یقین نہیں رکھتے۔ ایک چھوٹا سا طبقہ اس راستے پر چل پڑا ہے اور اسلام مخالفین کو اس طبقہ کی سرگرمیوں کی آڑ میں اصل اسلام اور تمام مسلمانوں کو نشانہ بنانے کا موقع مل گیا ہے۔ اگر بحث کو اس رخ پر موڑا جائے تو بہت طویل ہو جائے گی کہ بن لادن جیسے انتہا پسندوں کو پیدا کرنے والی طاقتیں کون ہیں اور کن حالات نے ان لوگوں کو بندوق اور رائفل اٹھانے پر مجبور کیا۔ مشرق وسطیٰ میں وہ کون سی تاریخی ناانصافیاں ہیں جن کے نتیجے میں انتفاضہ شروع ہوا اور حماس جیسی تنظیمیں پیدا ہوئیں۔ لیکن بہر حال عام مسلمان انتہا پسندی اور دہشت گردی کے ذریعہ اپنے مقاصد کی حصولیابی میں یقین نہیں رکھتا۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کن اقدامات کو دہشت گردی کہا جاتا ہے اور کن کو نہیں اور کیا مغربی طاقتوں نے دہشت گردی کی تعریف میں دوہرا پیمانہ اختیار نہیں کر رکھا ہے؟

اسلامی شعائر سے نفرت کا رجحان:

ان تمام سوالوں کے جواب تلاش کرنے سے قطع نظر اس پر غور کرنے کی

ضرورت ہے کہ ریڈیکل اسلام سے کس کو نقصان ہورہا ہے اور ریڈیکل مسلمان کن لوگوں کے ہاتھوں کے آلۂ کار بنے ہوتے ہیں۔

دراصل آج جو دہشت گردی مخالف مہم چل رہی ہے اس میں بظاہر ریڈیکل مسلمانوں کو ہدف بنایا جارہا ہے لیکن یہ باطن اسلام کی اصل صورت کو بگاڑنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ متعدد ملکوں میں انتہا پسند مسلمانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کے خلاف کارروائی تو کی ہی جارہی ہے، لیکن اسی کے ساتھ عام مسلمانوں کو بھی گیہوں میں گھن کی مانند پیسا جارہا ہے۔ پروپیگنڈہ تو یہ کیا جاتا ہے کہ مسلم دہشت گردوں کے خلاف کارروائی ہورہی ہے لیکن دراصل اس کی آڑ میں پوری دنیا میں ایک ایسی فضا بنائی جارہی ہے یا بنادی گئی ہے جس میں ہر وہ مسلمان مشکوک نظر آتا ہے جس کی داڑھی لمبی ہو اور جس کی وضع قطع راسخ العقیدہ مسلمانوں جیسی ہو۔ آج جس کی داڑھی جتنی لمبی ہے اس پر طالبان اور القاعدہ کا ایجنٹ ہونے کا اتنا ہی پختہ شبہ کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو داڑھی ٹوپی اور کرتا والے مسلمانوں کو محض ایک شبہے کی بنا پر طیارے سے کیوں اتارلیا جاتا ہے اور کئی دنوں تک پوچھ تاچھ کیوں کی جاتی ہے۔ جب بھی دہشت گردی مخالف کوئی رپورٹ الیکٹرانک میڈیا میں دکھائی جاتی ہے یا پرنٹ میڈیا میں شائع کی جاتی ہے تو اس کے ساتھ مدارس کے طلبا اور داڑھی ٹوپی والوں کی تصاویر کیوں پیش کی جاتی ہیں۔ امریکا، برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا، جرمنی اور دیگر کئی ملکوں میں مسلمانوں کے گھروں اور دفتروں پر چھاپے مارے جارہے ہیں۔ ان کو گرفتار کیا جارہا ہے اور ان کے خلاف مقدمات قائم کئے جارہے ہیں۔ آسٹریلیا میں ڈاکٹر محمد حنیف کے ساتھ تو جو کچھ ہوا وہ اسکی تازہ ترین مثال ہے۔ مغربی میڈیا کہنے کو تو شدت پسند مسلمانوں کے خلاف ہے لیکن حقیقتاً وہ اعتدال پسند مسلمانوں کے ساتھ بھی وہی رویہ اختیار کرتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو مسلم خواتین

کے پردے اور حجاب کو کیوں نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مغربی ملکوں کے اسکولوں میں حجاب والی مسلم طالبات کو کیوں نہیں داخلہ دیا جاتا یا ان کو کیوں نکال دیا جاتا ہے۔ اسکارف باندھنے والی مسلم دوشیزاؤں کو گری ہوئی نظروں سے کیوں دیکھا جاتا ہے اور ان کو پسماندہ اور مظلوم کیوں سمجھا جاتا ہے۔ مغربی میڈیا نے ریڈیکل مسلمانوں کی آڑ میں ایسا ماحول پیدا کردیا ہے جس میں عام مسلمانوں کی شرافت اور انسانیت ہی مشکوک ہوگئی ہے۔ اب تو مغربی ملکوں میں مساجد کے میناروں کی اونچائی پر بھی اعتراض ہونے لگا ہے اور کہا جانے لگا ہے کہ میناروں کی بلندی اسلام کی عظمت و سربلندی اور مغرب کی شکست کا تاثر پیدا کرتی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ پورا مغرب اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے بلکہ بہت سے ایسے دانشور اور تعلیم یافتہ لوگ بھی موجود ہیں جو اس ماحول سازی کے خلاف ہیں اور انقلابی مسلمانوں کی آڑ میں عام اور امن پسند مسلمانوں کو ہدف تنقید بنانے کے مخالف ہیں۔ آج جہاں ایک طرف متعدد مغربی دانشور اسلام کو اپنا دشمن تصور کرتے ہیں وہیں پروفیسر ڈیوڈ فورٹ جیسے لوگ بھی ہیں جن کا کہنا ہے کہ مذہب کسی کا دشمن نہیں ہوسکتا اور ریڈیکل مسلمان محض مٹھی بھر ہیں۔ ان کے اقدامات کی روشنی میں اسلام کا اصل چہرہ دیکھنے کے بجائے اعتدال پسند مسلمانوں کے افعال و اعمال کے آئینے میں اسلام کو دیکھنا چاہیے۔ ایسے لوگوں کا کہنا ہے کہ دہشت گردی مخالف جنگ میں ان مسلمانوں کو اپنا دشمن نہیں بنانا چاہیے جو بہت بڑی اکثریت کی شکل میں موجود ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسامہ بن لادن جیسے لوگ اصل اسلام کی نمائندگی نہیں کرتے نہ ہی وہ تاریخی اور مین اسٹریم اسلام کے نمائندہ ہیں۔ جبکہ اسی کے ساتھ ساتھ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کا کہنا ہے کہ صرف بن لادن جیسے لوگ ہی نہیں بلکہ تمام مسلمان امن کے دشمن ہیں اور ان میں دہشت گرد بننے کے امکانات

بہت زیادہ ہیں۔

ڈینیل پائپس کی اسلام دشمنی:

انتہا پسند یا ریڈیکل مسلمانوں کی آڑ میں اسلام اور تمام مسلمانوں کو نشانہ بنانے والوں میں ایک اہم نام ڈینیل پائپس Daniel Pipes کا بھی ہے۔ جو مسلم دشمنی میں پیش پیش رہتے ہیں اور امریکی صدر نے ان کو ایک امن بردار ادارہ کے بورڈ میں شامل کیا ہوا ہے۔ وہ فلیڈلفیا میں سکونت پذیر ہیں۔ مڈل ایسٹ فورم کے ڈائریکٹر اور نیویارک پوسٹ کے کالم نگار ہیں۔ وہ نیو کون نظریہ ساز New-con idealogue ہیں ان کے بارے میں WWW.Daniel Pipes پر جا کر مزید معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ان کا فلسفہ ہے کہ مشرق وسطی میں اسی صورت میں امن قائم ہوسکتا ہے جب اسرائیلی فوج پورے مشرق وسطی پر فتح حاصل کرلے۔

اُدھر پروفیسر فورٹ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ''اسامہ بن لادن روایتی اسلام کا نمائندہ نہیں ہے۔ بنیاد پرست اسلام اصل اسلام نہیں ہے بلکہ اس کے اندر سے پیدا ہوا ہے۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ وہابی مسلک اور القاعدہ یا اسلامی جہاد جیسے گروپوں میں فرق ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ بن لادن اپنی سیاسی جنگ میں اسلام کو شامل نہ کرے۔'' لیکن ڈینیل پائپس ان کے خیالات سے اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پروفیسر فورٹ سمجھتے ہیں کہ اصل مسئلہ القاعدہ میں سرگرم دہشت گردوں کے ایک چھوٹے سے گروپ نے پیدا کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پوری بنیاد پرست تحریک نے ہی مسئلہ پیدا کیا ہے۔ میرے نزدیک ہر بنیاد پرست مسلمان خونی تحریک کا ایک حصہ ہے چاہے اس کا اخلاق و برتاؤ کتنا ہی

امن پسند کیوں نہ ہو۔ وہ بنیاد پرست مسلمانوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ بن لادن کی اس جنگ میں ایک سپاہی کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس نے تہذیب (مغربی) کے خلاف چھیڑ رکھی ہے۔ پائپس کے خیال میں وہابی تحریک سے وابستہ مسلمان انتہا پسند تھے البتہ ان میں ایک طبقہ کم انتہا پسند تھا اور دوسرا زیادہ انتہا پسند تھا۔ اول الذکر طبقہ نے ثانی الذکر طبقہ کو شکست دیدی تھی اور بقول ان کے 1920 میں وہابی تحریک تقسیم ہوگئی۔ سعودی عرب میں زیادہ انتہا پسندوں کا جو گروپ قائم ہوا طالبان گروپ اس کا ایک حصہ ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس گروپ کو ملنے والے فنڈ کا ایک بڑا حصہ سعودی عرب سے آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہابیوں اور اسامہ بن لادن میں براہ راست لائن قائم ہے۔

بظاہر امن پسند حقیقتاً انتہا پسند:

ڈینیل پائپس اس وضاحت کے بعد کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ ان میں سے ایسے بہت سارے جن کا حلیہ بشری بظاہر امن پسندی کی دعوت دیتا ہو لیکن حقیقتاً ان کو ممکنہ قاتل ہی سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے بن لادن کے گروپ کو نازیوں اور لینن پرستوں کے مساوی قرار دیا ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ وہ غیر تشدد پسند انداز میں اپنی زندگی گزارتے ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بربریت پر مبنی قوت کی حمایت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بھی بربریت پسند ہیں اور ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرنا چاہیے۔ ڈینیل پائپس اپنے نظریے کے ثبوت میں پاکستان اور فلسطین کے ان مٹھی بھر مسلمانوں کی رائے کو پیش کرتے ہیں جو بقول ان کے گیارہ ستمبر کے حملوں کو اسلام کی رو سے قابل قبول تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود کہتے ہیں کہ پاکستان اور فلسطین کے مسلمانوں کی اکثریت ایسا نہیں سمجھتی صرف

ایک طبقہ ایسا سمجھتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس طبقے کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ (واضح رہے کہ رائے شماری سے متعلق بین الاقوامی ادارہ گیلپ انٹرنیشنل نے 35 مسلم ملکوں میں جو سروے کیا ہے اس کے مطابق مسلمانوں کی بہت چھوٹی سی اقلیت گیارہ ستمبر کے حملوں کی حمایت کرتی ہے۔ وہ بھی بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر اور یہ حمایت مذہبی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاسی بنیاد پر کی جاتی ہے۔) گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد فلسطین میں ایک گروپ نے جشن منایا تھا۔ اس کا حوالہ مسلم مخالفین بار بار دیتے ہیں۔ لیکن فلسطینیوں کے گروپ نے اس پر جشن کیوں منایا وہ اس کے تاریخی اسباب کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ڈینیل پائپس مذکورہ مثال دینے کے بعد کہتے ہیں کہ مسلم رائے عامہ کی ایک قابل لحاظ تعداد پہلے سے ہی بن لادن کے خیمے میں ہے، مزید برآں مجموعی طور پر بنیاد پرست اسلامی رائے عامہ بن لادن کے اہداف اور طریقہ کار سے اتفاق رکھتی ہے۔

صرف بن لادن ہی مسئلہ نہیں:

پروفیسر فورٹ واشنگٹن کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اسے چاہیے کہ وہ مسلمانوں کی بڑی اکثریت کے ساتھ مل کر کام کرے تاکہ اس تشدد پسند گروپ کو الگ تھلگ کیا جا سکے۔ لیکن ڈینیل پائپس اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ واشنگٹن کے پالیسی سازوں کو یہ بتانے سے نہیں چوکتے کہ مسئلہ دراصل یہ چھوٹا سا گروپ نہیں ہے جس کی طرف فورٹ اشارہ کرتے ہیں بلکہ بنیاد پرستوں کا وہ بڑا گروپ ہے جو کہ مسلم آبادی کا دس پندرہ فیصد ہے۔ (حالانکہ اگر دیکھا جائے تو بن لادن کا گروپ اتنا بڑا نہیں ہے کہ وہ کل مسلم آبادی کا دس پندرہ فیصد ہو جائے وہ تو صفر اعشاریہ کچھ فیصد میں آئے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پائپس اس گروپ کے علاوہ ان لوگوں کو بھی

مسئلہ اور خطرہ بتاتے ہیں جو اسلام کی بنیادوں پر سختی سے قائم ہیں اور جن کو پائپس جیسے لوگ بنیاد پرست کہتے ہیں) پروفیسر فورٹ کہتے ہیں کہ امریکی حکومت کو ایران اور سعودی عرب کی حکومتوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے تاکہ تشدد پسند گروپ کو کنارے لگایا جاسکے۔لیکن ڈینیل پائپس کا کہنا ہے کہ میں سعودی عرب، ایران اور بن لادن کے گروپ کو ایک دوسرے سے مختلف نہیں سمجھتا۔ان کا کہنا ہے کہ یہ تینوں ایک ہی مسئلے کی الگ الگ شکلیں ہیں۔لہٰذا وہ ان تینوں کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھنے کے حق میں ہیں اور وہ سلوک کیسا ہونا چاہیے، اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے۔ پروفیسر فورٹ اپنے مضمون میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بن لادن نے جو ''برائی'' پھیلا رکھی ہے اسکی شناخت کی جائے اور عالم اسلام کی بڑی اکثریت کے ساتھ ربط ضبط قائم کیا جائے اور اس کے ساتھ مل کر کام کیا جائے۔لیکن پائپس کا اصرار ہے کہ بن لادن کی پھیلائی ہوئی برائی کی شناخت کے بجائے اس حمایت کی شناخت کی جائے جو اس کو حاصل ہے اور پھر امریکیوں کو چاہیے کہ وہ مسلم آبادی کے دس پندرہ فیصد کے ساتھ ٹکراؤ اور جنگ کا عمل شروع کریں۔ان کے مطابق جب تک اس دس پندرہ فیصد آبادی کو کمزور نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک بن لادن کے گروپ اور اس کی کارروائیوں کو بھی شکست نہیں دی جاسکتی۔

کوئی بھی مسلم شبہے سے بالاتر نہیں:

اس تجزیہ کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اگر ایک طرف پروفیسر فورٹ جیسے امن پسند اور صلح جو افراد موجود ہیں تو دوسری طرف ڈینیل پائپس جیسے اسلام مخالف اور جنگ جو بھی موجود ہیں جو اسامہ بن لادن جیسے ریڈیکل مسلمانوں کی آڑ میں ان تمام مسلمانوں کے خلاف کارروائی کی وکالت کرتے ہیں جو اسلام کی

بنیادوں پر سختی سے قائم ہیں۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمانوں کو بنیاد پرست کہتے ہیں اور آج میڈیا کی شرانگیزی کے سبب بنیاد پرست ایک ایسی اصطلاح بن گئی ہے جسے ایک گالی تصور کیا جاتا ہے یا اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ بنیاد پرستی کو ایک منفی مفہوم پہنا دیا گیا ہے۔ آج ایسے لوگوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جو ڈینیل پائپس کے نظریے کے طرفدار ہیں اور ایسے لوگ ہی انقلابی مسلمانوں کی آڑ میں تمام مسلمانوں کے خلاف کارروائی کو جائز تصور کرتے ہیں اور جو ہر اس مسلمان کو شک وشبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں جو وضع قطع میں اسلامی دکھائی دیتا ہو۔ یا پھر مغربی لباس ہی میں کیوں نہ ہو مگر اس کی داڑھی بڑی ہو اور وہ نمازی ہو اور حلیے بشرے سے مغربی باشندوں سے الگ تھلگ نظر آتا ہو۔ قرآن کی بعض آیات کو سیاق وسباق سے کاٹ کر ان کے مفہوم کی روشنی میں یہ پروپیگنڈہ کرنا کہ وہ قتل وخوں ریزی کی دعوت دیتا ہے، اسی گروہ کا کام ہے، مغربی میڈیا اس پروپیگنڈہ میں ایک اہم رول ادا کر رہا ہے اور ریڈیکل اسلام کی آڑ میں اصل اسلام کو نشانہ بنانے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

یہ گروپ زبانی طور پر تو کہتا ہے کہ اسلام دہشت گردی کا مذہب نہیں اور اسلام تشدد کی تعلیم نہیں دیتا لیکن اس منافقانہ اعتراف کے باوجود یہ گروپ اپنے اقدامات سے تشدد پسند طبقہ کے اسلام کو ہی اصل اسلام بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر موقع محل دیکھ کر یہ رائے دیتا ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں تشدد اور خون خرابہ کے امکانات بہت زیادہ ہیں اور جو ہر اس تہذیب اور معاشرے کا دشمن ہے جہاں اس کے اصولوں پر عمل نہ کیا جا رہا ہو۔ یہ اسلام مخالف طبقہ یہ جاننے اور سمجھنے کے باوجود کہ اسلام ایک امن پسند مذہب ہے، مختلف بہانوں سے، اس کا رشتہ، تشدد سے جوڑتا ہے اور اس کے ثبوت کے طور پر ریڈیکل مسلمانوں کے کردار کو پیش کرتا ہے۔ اس طبقہ کے پروپیگنڈہ کا ہی نتیجہ ہے کہ آج جو لوگ اسلام سے حقیقی

طور پر واقف نہیں ہیں وہ اسلام کو ایک خطرناک مذہب تصور کرنے لگے ہیں۔ میڈیا ایسے پروپیگنڈے کو ہوا دیتا ہے اور اسلام کی منفی اور مسخ شدہ شکل پیش کرنے میں معاونت کرتا ہے۔

یہ خطرناک پروپیگنڈہ اس قدر کامیاب ہے کہ مغرب کی سرحدوں سے نکل کر مشرق کی حدود میں بھی داخل ہوگیا ہے اور آج ہندوستانی میڈیا بھی ان لوگوں اور تنظیموں کو ریڈیکل اور دہشت گرد کہنے لگا ہے جن کا ایسے گروپوں سے کوئی تعلق نہیں۔ نائن الیون کے بعد ریڈیکل مسلمانوں کے خلاف جو مہم شروع ہوئی ہے اس کا دائرہ بڑھتا جا رہا ہے اور بے قصوروں کو نشانہ بنانا اسی مہم کا شاخسانہ ہے۔ اس کا خطرناک نتیجہ اس شکل میں بھی برآمد ہونے لگا ہے کہ ایسے لوگ بھی بدرجۂ مجبوری تخریبی راستے پر چل پڑتے ہیں جو اسکو درست نہیں سمجھتے۔ گویا یہ مہم دہشت گردی کو ختم کرنے کے بجائے اس کو بڑھانے میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔

❀❀❀

دہشت گردی کے سلسلے میں دوہرا پیمانہ

(فلسطین و اسرائیل کے حوالے سے)

نائن الیون کے بعد میڈیا پر دہشت گردی کا موضوع چھایا ہوا ہے۔ ہندوستانی میڈیا ہو، مغربی میڈیا ہو یا پھر عالمی میڈیا ہو، ہر جگہ دہشت گردی کو ایک مرغوب موضوع کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس کا دوسرا اور ضمنی پہلو یہ ہے کہ دہشت گردی سے اسلام اور مسلمانوں کو جوڑنا ایک فیشن بن گیا ہے۔ میڈیا نے دہشت گردی کے تعلق سے دوہرا پیمانہ بھی اختیار کر رکھا ہے۔ وہ دہشت گردی کی تشریح دو طرح سے کرتا ہے۔ مسلمانوں کا معاملہ ہو تو میڈیا ادارے زبردست جوش میں آجاتے ہیں اور اگر معاملہ دوسروں کا ہو تو اسے انتہائی ہلکا کر کے پیش کرتے ہیں۔ اسلام مخالف طاقتیں اگر مسلمانوں پر ظلم کریں تو وہ دہشت گردی کے زمرے میں نہیں آتا اور اگر مسلمان ظلم کے خلاف آواز بلند کریں یا مزاحمت کریں تو اسے دہشت گردی قرار دیدیا جاتا ہے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو:

ماضی میں بھی طاقتور ممالک کمزور ممالک کے ساتھ زیادتیاں کرتے تھے اور ان کے علاقوں کو اپنی جاگیریں بنا لیتے تھے۔ عوام کو ظلم وستم کا نشانہ بھی بنایا جاتا تھا۔ لیکن ان کو دہشت گردی کا نام کبھی نہیں دیا گیا۔ مسلم ممالک اگر اپنے دفاع میں

ہتھیار اکٹھا کریں یا بنائیں تو انہیں دنیا کے لیے خطرہ بتایا جاتا ہے اور اسرائیل جب یہی سب کرتا ہے تو اسے اپنے دفاع میں اٹھایا گیا قدم قرار دیا جاتا ہے۔ جب ایران کے صدر محمود احمدی نژاد نے کہا کہ اسرائیل نے فلسطینیوں پر جو مظالم ڈھائے ہیں انکے پیش نظر اسکو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جانا چاہیے، تو میڈیا چیخ اٹھا تھا اور اس نے احمدی نژاد پر ایسا تبرا پڑھا کہ لگ رہا تھا کہ بس اب ان کو فنا کر دیا جائے گا یا اگر ان کی زبان بند نہیں کی گئی تو وہ اسرائیل اور امن پسند دنیا کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔ جب امریکا میں صدارتی امیدوار کی دوڑ میں شامل ہلیری کلنٹن نے کہا کہ اگر وہ برسر اقتدار آ گئیں تو ایران کے نیوکلیائی پروگرام کو نیست و نابود کر دیں گی تو ان کے اس بیان کو خطرہ نہیں بتایا گیا اور اس کی مذمت نہیں کی گئی۔ میڈیا نے اسے قیام امن کی کوشش سے تعبیر کیا۔ یعنی اگر کوئی طاقتور ملک ظلم کرے تو وہ انصاف اور کمزور ملک اپنے دفاع میں آواز اٹھائے تو وہ دہشت گردی۔ یہی ہے میڈیا کا دوہرا پیمانہ اور اس کا دوغلا طریقہ کار۔

تم دہشت گرد ہم امن پسند:

رے ہنانیا Ray Hanania ایک فلسطینی امریکی رائٹر ہیں اور شکاگو میں سکونت پذیر ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ”میں اس امید کے ساتھ روزانہ صبح بیدار ہوتی ہوں کہ ایسی سرخیاں پڑھوں کہ یہودی دہشت گرد عربوں کا قتل کرتے ہیں۔ لیکن آج تک وہ صبح نہیں آئی۔ ایک روز اسرائیلی جنونی باز آبادکاروں نے تین فلسطینی شہریوں کو ہلاک کر دیا ان میں ایک ساڑھے تین ماہ کی بچی بھی تھی۔ لیکن میڈیا نے لفظ دہشت گرد کا استعمال نہیں کیا۔ اس نے حملہ آوروں کو اسرائیلی انڈر گروپ یا ہوشیار باز آبادکار کہا۔ حالانکہ اگر ایسی ہی کسی کارروائی میں

فلسطینی ملوث ہوں تو ان کے لیے انتہائی سخت اصطلاح جیسے بربریت پسند، دہشت گرد اور خون کے پیاسے عرب قاتل کہا جاتا ہے۔''

یہ کوئی تنہا واقعہ نہیں ہے جس کا ذکر بنانیا نے کیا ہے بلکہ یہ یومیہ کا معمول ہے۔ فلسطینی اگر پتھر بھی پھینکیں تو وہ دہشت گرد ہو جاتے ہیں، ان کے لیے اسلامی دہشت گرد اور اسلامی جنونی دہشت گرد کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، لیکن جب پتھر بازی کرنے والے انہی فلسطینیوں پر اسرائیلی فوجی گولہ باری کر کے ان کو ہلاک کر دیتے ہیں تو میڈیا اس کو جوابی کارروائی قرار دیتا ہے۔ میڈیا میں جس قسم کی سرخیاں آتی ہیں، اسی طرح کا ردعمل بھی سامنے آتا ہے۔ خیال رہے کہ اگر کسی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس نے دہشت گردی مچا رکھی ہے تو اس کے تئیں لوگوں کا نقطۂ نظر اور ردعمل بہت سخت ہوگا۔ لیکن اگر کسی ظالم کے بارے میں میڈیا میں ایسی سرخیاں اور خبریں آئیں کہ اس نے جوابی کارروائی کی جس میں اتنے لوگ مارے گئے تو اس کے تعلق سے لوگوں کا رویہ نرم ہوگا۔ میڈیا فلسطینیوں کے بارے میں انتہائی سخت الفاظ اور اصطلاحات استعمال کر کے دنیا کو یہ دکھاتا آ رہا ہے کہ فلسطینی دہشت گرد ہیں اور اسرائیلی معصوم اور مظلوم ہیں۔ بہت سے لوگ فلسطینیوں پر الزام عائد کر کے اسرائیلی نقطۂ نظر کو قبول کر لیتے ہیں یا اسے اور مستحکم بنا دیتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ اس پر کوئی توجہ نہیں دیتے کہ اسرائیل جو امن تجاویز پیش کرتا ہے وہ کس طرح یک طرفہ اور جانبدارانہ ہوتی ہیں۔ میڈیا اس کی تشہیر نہیں کرتا کہ اسرائیل نے (1948 اور پھر 1967 میں) جن فلسطینی اور عرب زمینوں پر قبضہ کر لیا ہے وہ اسے واپس کرنی چاہئیں یا اس کے نتیجے میں جو فلسطینی بے گھر ہو گئے ہیں ان کو گھر دیا جانا چاہیے۔ مرحوم فلسطینی رہنما یاسر عرفات یہ مطالبہ کرتے رہ گئے کہ جن فلسطینیوں کو ان کی زمینوں اور مکانوں سے جبراً بے دخل کر دیا گیا ہے ان کو واپس آنے کا حق ہے

اور انہیں یہ حق ملنا چاہیے۔ لیکن اسے آج تک تسلیم نہیں کیا گیا۔ ہنانیہ کہتی ہیں کہ ان کے اپنے مکانوں اور زمینوں پر بھی یہودی پناہ گزینوں نے قبضہ کرلیا ہے اور یروشلم کے نزدیک Gilo کے مقام پر ان کی زمین پر یہودی بستی بسادی گئی ہے۔ اب اگر وہ اپنی زمین اور مکان واپس پانے کی جدوجہد کریں تو انہیں بھی دہشت گرد قرار دیدیا جائے گا۔

سچائی سے خوفزدہ رپورٹر:

جب اسرائیلی فوجیوں نے چھ سو فلسطینی شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو میڈیا نے کہا کہ یہ اس لیے ہوا کہ فلسطینیوں نے اس وقت کے وزیر اعظم ایہود باراک کی امن تجویز نامنظور کردی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل تشدد کو ہوا دیتا ہے لیکن بیشتر امریکی صحافی اس سچائی کی رپورٹنگ نہیں کرتے۔ بالخصوص مغربی صحافی امریکی سنسر شپ قانون کے خوف سے حق بیانی سے باز رہتے ہیں۔ عرب صحافیوں پر بھی قانون کی تلوار لٹکی رہتی ہے اور وہ بھی بعض اوقات صحیح رپورٹنگ نہیں کرتے۔ امریکی اور مغربی صحافی عرب صحافیوں پر الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ اپنے قوانین سے خوفزدہ ہوکر صحیح رپورٹنگ نہیں کررہے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو چھپا جاتے ہیں کہ وہ ان سے زیادہ ڈرتے ہیں اور اپنے فرائض سے کوتاہی ان سے زیادہ کرتے ہیں۔ دراصل ایسے صحافی ایک دباؤ کے تحت کام کرتے ہیں اور رپورٹر حضرات اپنے اسرائیل نواز ایڈیٹروں اور مالکوں کے خوف سے صحیح رپورٹنگ نہیں کرتے۔

فلسطینی علاقوں میں اسرائیلی فوجیوں کی موجودگی بھی تشدد کا ایک سبب ہے۔ اور جب اسرائیلی فوجی فلسطینیوں کو دبانے کے لیے زیادتی کرتے ہیں تو میڈیا ان کو حق بجانب ٹھہراتا ہے۔ یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلسطینیوں پر اسرائیلی حملے کی دو

صورتیں ہیں۔ ایک اسرائیلی فوجیوں کا حملہ اور دوسرا یہودی آبادکاروں کا حملہ۔ بنانیہ کہتی ہیں کہ ''اسرائیلی باز آبادکار دنیا کے بدترین جنونی لوگ ہیں لیکن میڈیا ان کو جنونی نہیں کہتا ہاں وہ فلسطینیوں کو ضرور اسلامی جنونی کہتا ہے۔'' یہ اسرائیلی جنونی فلسطینیوں کے خلاف ایک نفرت انگیز جنگ میں ملوث ہیں جس میں وہ عربوں کا قتل کرتے ہیں اور ان کی زمینوں کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ اگر ان کی کارروائیوں کے خلاف عرب احتجاج یا مزاحمت کرتے ہیں تو میڈیا چیخ اٹھتا ہے کہ بے قصور اسرائیلیوں پر حملہ کر کے فلسطینی دہشت گردوں نے اتنے لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ یہ نفرت انگیز جنگ اس وقت سے جاری ہے جب فلسطینیوں کی زمین غصب کر کے اسرائیلی مملکت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ عربوں نے انتفاضہ کے تحت اسرائیلی غاصبانہ قبضے کے خلاف بغاوت کا آغاز کیا اور جب عربوں اور فلسطینیوں کے اقدامات کے نتیجے میں اسرائیلیوں کی ہلاکت ہوئی یا وہ زخمی ہوئے تو انتفاضہ کو دہشت گردی کا جامہ پہنا دیا گیا۔

ہولوکاسٹ کی دھمکی:

جب فلسطینیوں نے اسرائیلیوں کی ناک میں دم کر دیا تو اسرائیلی حکام نے فلسطینیوں کو ہولوکاسٹ کی دھمکی دی۔ اسرائیل کے سابق نائب وزیر دفاع Matanvilnai نے اسرائیلی ریڈیو پر اپنے دھمکی آمیز پیغام میں کہا کہ ''فلسطینی ہولوکاسٹ کی دعوت دے رہے ہیں کیونکہ ہم اپنے دفاع میں تمام طرح کی طاقت کا استعمال کریں گے۔'' حالانکہ اگر دیکھا جائے تو جارح طاقت تو جارح ہوتی ہے۔ اس کے لیے کیا اپنا دفاع کرنا، دفاع تو مظلوم کرتا ہے۔

واضح رہے کہ گذشتہ ساٹھ برسوں سے یہودی خصوصاً اسرائیلی ہولوکاسٹ کا

ذکر کر کے یہودیوں پر نازیوں کے مظالم کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس سلسلے میں وہ اسے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ نازیوں کے مظالم کے شکار صرف یہودی ہی نہیں بلکہ دوسرے بھی ہوئے ہیں۔لیکن جب ایران کے صدر احمدی نژاد ہولوکاسٹ پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں تو پورا میڈیا ان کے بیان کو اس انداز میں پیش کرتا ہے جیسے انھوں نے کسی تاریخی سچائی کو جھٹلا دیا ہو۔یہودی میڈیا ہولوکاسٹ کا نام تو لیتا ہے لیکن اسکی سچائی پر اظہار خیال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔اسرائیلی ہولوکاسٹ کی آڑ میں خود کو تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں اور اسرائیل کو ایک مظلوم ریاست بنا کر پیش کرتے ہیں۔وہ فلسطینی عوام پر ڈھائے جانے والے مظالم کو ہولوکاسٹ کے نام پر جائز ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔حالانکہ سچائی یہ ہے کہ فلسطینی اسرائیلی ہولوکاسٹ کے شکار بنتے آرہے ہیں۔

اسرائیلی بربریت بھی انصاف ہے:

غزہ پٹی میں کام کرنے والے ایک صحافی محمد عمر کے مطابق جو کہ rafahtoday.org سے وابستہ ہیں، فروری 2008 کے آخری دنوں میں اسرائیلی فوجوں کے ہاتھوں کم از کم تیس فلسطینی ہلاک کیئے گئے جن میں بچے اور خواتین بھی تھیں۔یہاں تک کہ اسرائیلی دہشت گردوں کے ذریعہ چھ ماہ کے بچوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ان کارروائیوں میں 370 بچے زخمی بھی ہوئے۔اس قتل کی وجہ یہ تھی کہ فلسطینی اسرائیلی جارحیت کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے جس کے دوران ایک اسرائیلی بازآبادکار اور دو فوجی مارے گئے تھے۔بس اس کو بہانہ بنا کر فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا۔فلسطینیوں کے پاس گھریلو ساخت کے راکٹ ہیں جبکہ اسرائیلی فوجیوں کے پاس ایف 16 جنگی طیارے، میزائیل کلسٹر بم اور توپ

خانے ہیں۔ میڈیا فلسطینیوں کے ذریعہ دو ایک اسرائیلیوں کی ہلاکت پر جتنا شور مچاتا ہے اسرائیلیوں کے ذریعہ قتل عام پر اتنا شور نہیں مچاتا۔

جہاں فلسطینی کارروائیوں کی رپورٹنگ میں انتہائی سخت الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہیں اسرائیلی بربریت کی رپورٹنگ میں نرم لہجہ اپنایا جاتا ہے۔ ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ تک جاری اسرائیلی ناکہ بندی کے نتیجے میں پندرہ لاکھ فلسطینیوں کی زندگی اجیرن ہوگئی۔ فلسطینی بچے بھوک سے بلکتے رہے، رہائشی علاقوں میں بمباری ہوتی رہی، لوگوں کا اغوا اور سیاستدانوں کا قتل کیا جاتا رہا۔ لیکن امریکی اور یوروپی رہنماؤں کی حمایت یافتہ اسرائیلی فوجیوں کے خلاف اس طرح آواز بلند نہیں ہوئی جیسی کہ ہونی چاہیے تھی۔ اسرائیل نے اس دہشت و بربریت کو جائز قرار دیا اور اسرائیلی سپریم کورٹ نے بھی اسکی تائید کی۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بی بی سی، سی این این، نیویارک ٹائمز اور دیگر میڈیا ادارے بھی اسرائیل کی حمایت جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہ اسرائیل کے جرائم کی پردہ پوشی کرتے ہیں اور اسرائیلی پروپیگنڈہ کی تشہیر کرتے ہیں۔ مغربی میڈیا اسرائیل کو انتہائی مہذب اور جمہوری ملک قرار دیتا ہے اور جب فلسطین میں جمہوری انداز میں حماس کی حکومت قائم ہوتی ہے تو اسکی مخالفت کرتا ہے۔ وہ اسرائیل کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ دہشت گردانہ سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہے بلکہ صرف جوابی کارروائی کرتا ہے۔ کیا یہی جوابی کارروائی ہے کہ پتھر پھینکنے والوں پر بم برسائے جائیں۔ وہ فلسطینی عورتوں اور بچوں کو ہلاک کرتے ہیں اور ان کے گھروں کو تباہ کرتے ہیں، کیا یہی جوابی کارروائی ہے۔ دراصل یہ نہتے فلسطینی عوام کے خلاف اسرائیلی دہشت گردی ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ مگر میڈیا ایسے مواقع پر اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیتا ہے اور اگر دیکھتا بھی ہے تو دوسری طرف۔ اسرائیل کہتا ہے کہ ہم امن چاہتے ہیں۔ لیکن کیا امن کا مطلب یہی ہے کہ

زمینوں، مکانوں اور یہاں تک کہ ملکوں کے حقیقی، باشندوں اور مالکوں کو طاقت کے زور پر بے دخل کردیا جائے اوران پر غاصبانہ قبضہ کرلیا جائے۔اور جب وہ اپنا وطن مانگیں تو ان پر بموں اور میزائلوں کی برسات کردی جائے۔

درحقیقت دہشت گردی وہ نہیں ہے جو بے قصور اور نہتے فلسطینی کررہے ہیں بلکہ دہشت گردی وہ ہے جو اسرائیل کررہا ہے۔اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اس وقت میڈیا نے جو اسلاموفوبیا پھیلا رکھا ہے اور اسلام کو دہشت گردی کا مذہب قرار دے رکھا ہے، وہ دہشت گردی ہے بلکہ بدترین دہشت گردی ہے۔کیا مغربی میڈیا تعصب کی عینک اتار کر اپنی ننگی آنکھوں سے تلخ حقائق کا مشاہدہ کرے گا اور دہشت گردی کے سلسلے میں اپنا دوہرا پیمانہ ترک کرکے اپنے حقیقی فرائض منصبی سے سبک دوش ہوگا۔

❁❁❁

قرآن مخالف مہم اور میڈیا

جب نیدرلینڈ کے اسلام دشمن ممبر پارلیمنٹ گیرٹ وائلڈرس نے فتنہ کے نام سے قرآن مخالف فلم بنائی تو وہ اسلام دشمنی کا کوئی نیا اور پہلا واقعہ نہیں تھا۔ بلکہ اسلام دشمن مہم کی مسلسل کڑیوں میں سے ایک کڑی تھی۔ دراصل قرآن دشمنی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا قدیم خود قرآن کریم ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی قرآن کی مخالفت کی جاتی تھی اور کہا جاتا تھا کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ ایک شاعری ہے، ایک جادو ہے۔ قرآن دشمنی میں پیش پیش رہنے والے اپنے لوگوں کو قرآن سننے سے بھی منع کرتے تھے۔ لیکن جب ان کو چیلنج کیا گیا کہ اگر یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ انسانی شاعری ہے تو وہ اس کی طرح کی ایک آیت بنا کر دکھادیں۔ بالآخر وہ ایک بھی آیت تخلیق نہیں کر سکے اور قرآن مخالفوں کو بھی کہنا پڑا کہ واقعی یہ کسی بشر کا کلام نہیں ہے۔

ان قرآن دشمنوں کی نسلیں آج بھی موجود ہیں۔ گیرٹ وائلڈرس قرآن مخالف سازشیوں کا محض ایک ادنیٰ سا آلۂ کار ہے۔ خود ہندوستان میں بھی قرآن کے دشمنوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہتے ہیں۔ آر، ایس، ایس اور وشو ہندو پریشد جیسی فاشسٹ تنظیموں میں ایسے لوگوں کی خاصی تعداد موجود ہے جو قرآن پر قتل وخون کی تعلیم دینے والی کتاب ہونے کا الزام عائد کرتے ہیں۔ گیرٹ وائلڈرس کی مانند آر، ایس، ایس کے ایلچیوں اور نمائندوں نے بھی متعدد

آیات کو سیاق وسباق سے کاٹ کر ایک فہرست بنا رکھی ہے اور جب بھی دل کرتا ہے وہ فہرست میڈیا کے سامنے پیش کر کے یہ پروپیگنڈہ کرنے لگتے ہیں کہ قرآن جنگ وجدال اور قتل عام کا درس دیتا ہے۔ قرآن کافروں کو تہہ تیغ کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور اس میں انسانی خون سے ہاتھ رنگنے کے پیغامات بھرے پڑے ہیں۔ دراصل ایک سازش کے تحت قرآنی آیات کو سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ وہ قرآن کی تعلیمات سے بیگانہ افراد کو گمراہ کرسکیں۔ آر، ایس، ایس اور وشو ہندو پریشد کے اس گمراہ کن پروپیگنڈہ سے متاثر ہوکر کلکتہ کے ایک قرآن دشمن شخص چاند مل چوپڑہ نے بھی قرآن مقدس پر ایسے ہی الزامات عائد کئے تھے اور اس کتاب پر جوکہ کسی انسان کا نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے، پابندی لگانے کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن اس مثل کے مصداق کہ چاند پر تھوکنے والے کا خود اپنا ہی چہرہ گندا ہو جاتا ہے، چاند مل چوپڑہ سمیت تمام قرآن دشمنوں کی صورتیں مسخ ہوگئیں اور ان کا انجام بہت ہی بھیانک ہوا۔ کفار قریش سے لیکر چاند مل چوپڑہ، سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین، آر ایس ایس کے ایجنٹوں اور گیرٹ وائلڈرس تک ایسے بے شمار لوگ ہیں جن کو قرآن دشمنی کی سزا بھگتنی پڑی ہے۔ سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین اور ڈچ ممبر پارلیمنٹ وائلڈرس کو کن حالات میں رہنا پڑ رہا ہے، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ گیرٹ وائلڈرس گرچہ اسلام مخالفین کا ہیرو ہے لیکن فلم فتنہ بنانے کے بعد وہ ایک عالم کا معتوب ہوگیا ہے اور اس کے اپنے ملک میں بھی اسکے مخالفین کی بہت بڑی تعداد پیدا ہوگئی ہے جو اس پر لعنت بھیجتی رہتی ہے۔

آزادیٔ اظہار کی غلط تعبیر وتاویل:

جب بھی اس قسم کی کوئی چیز سامنے آتی ہے تو ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کی جانب سے اسکی مخالفت کی جاتی ہے اور اسلام دشمن عناصر آزادیٔ

اظہار خیال کے نام پر اسکی حمایت کرتے ہیں۔ میڈیا بھی میدان میں کود پڑتا ہے اور مسلمانوں کی مخالفت میں اسلام دشمن عناصر کی تائید وحمایت کرنے لگتا ہے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا مسلمانوں پر یلغار کر دیتا ہے اور اسلام دشمنوں کے دفاع میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگتا ہے۔ جب ڈنمارک کے اخباروں میں اہانت رسول کے کارٹونوں کی اشاعت ہوئی، اس وقت بھی میڈیا نے آزادئ اظہار خیال کے نام پر کارٹونوں کی حمایت کی اور جب ڈچ ممبر پارلیمنٹ نے قرآن دشمن فلم بنائی تو اس وقت بھی اس پر پابندی کا مطالبہ کرنے والوں کے خلاف ایک محاذ کھول دیا گیا۔ میڈیا ایسے مواقع پر یکسر بے نقاب ہوجاتا ہے اور اسکی نام نہاد غیر جانبداری پتہ نہیں کہاں گم ہوجاتی ہے۔

گیرٹ وائلڈرس نے فتنہ نام سے جوفلم بنائی ہے اس میں بھی قرآن مجید کی متعدد آیات کو سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کیا گیا ہے اور دعوا کیا گیا ہے کہ قرآن مجید قتل وخونریزی کی دعوت دیتا ہے۔ لہٰذا ان آیات کو قرآن سے حذف کردیا جانا چاہیے۔ اس فلم پر مختلف ملکوں میں احتجاج کی آواز بلند ہوئی اور 26 اسلامی ممالک نے اس پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا۔ حالانکہ اس پر پابندی نہیں لگائی گئی تاہم اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل بان کی مون سمیت متعدد عالمی رہنماؤں نے اس کی مذمت کی۔ وائلڈرس نے قرآن کی متعدد آیات کو فتنہ قرار دیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وائلڈرس اور اس کی یہ فلم دونوں بذات خود فتنہ ہیں اور نہ صرف اس فلم پر بلکہ وائلڈرس پر بھی اس طرح کی باتیں کرنے پر پابندی لگادی جانی چاہیے۔

جب وائلڈرس نے یہ پندرہ منٹ کی فلم بنائی اور اسے دکھانے کی کوشش کی تو کوئی بھی چینل اس کے لیے تیار نہیں ہوا۔ اس نے اسے ویب سائٹ پر پیش کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی ناکام رہا۔ لیکن بہرحال اسے ویب سائٹ پر پیش

کر دیا گیا اور دعوایہ کیا گیا کہ ڈنمارک کے اخباروں میں شائع کارٹونوں کو فلم سے حذف کر دیا گیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں اب بھی توہین آمیز کارٹون موجود ہیں۔ اور وہ ایسے ہیں کہ ان سے مسلمانوں کے جذبات بری طرح مجروح ہوتے ہیں۔ فلم کا آغاز سورہ انفال سے ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی گیارہ ستمبر کو امریکہ کے ٹوین ٹاور پر دہشت گردانہ حملے کی تصویر دکھائی جاتی ہے۔

فلم کا آغاز:

فلم کے آغاز میں ایک وارننگ دی جاتی ہے کہ اس میں انتہائی دلخراش مناظر بھی ہیں۔ اشارہ دہشت گردانہ واقعات کی طرف ہے۔ اس کے بعد حضور اکرم کا ایک کیری کچر دکھایا جاتا ہے جو کہ ڈینش اخباروں میں شائع ہوا تھا۔ اس شر انگیز کیری کچر میں دستار میں بم رکھا ہوا ہے اور ایک ٹائم بم ٹک ٹک کی آواز کرتا ہے۔ ایک نامعلوم امام کو اسلام کی تبلیغ کرتے دکھایا گیا ہے اور دہشت پسندانہ واقعات سمیت ''اسلام کے نام پر'' تشدد اور اشتعال انگیزی دکھائی جاتی ہے۔ اس میں گیارہ ستمبر کے حملے کی تصاویر کے علاوہ میڈرڈ ٹرین دھماکہ، لندن بم دھماکہ اور القاعدہ اور طالبان کے ہاتھوں دوسروں کا قتل اور سر قلم کرتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے۔ میڈرڈ ٹرین دھماکہ کے بعد دھوئیں کے غبار سے ایک امام نکلتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ ''جب غیر مسلموں کا قتل ہو جاتا ہے تو اللہ خوش ہوتا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی سات جولائی 2005 کے لندن دھماکہ کے مناظر اور ایک انڈر گراونڈ ٹرین اور بس میں دھماکے دکھائے جاتے ہیں۔

اس کے بعد سورہ نساء کی تلاوت ہوتی ہے اور شیخ بکر السمر ائی کو ایک تلوار اٹھاتے اور یہ اعلان کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے کہ ''جب اللہ اجازت دے گا تو اے

سرزمین محمد، یہاں تک کہ پتھر بھی کہے گا کہ اے مسلمان میرے پیچھے ایک یہودی چھپا ہوا ہے آؤ اور اس کا سر قلم کر دو اور میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ اللہ اکبر اللہ کے لئے جہاد۔'' اس کے بعد ایک تین سال کی بچی کہتی ہے کہ یہودی خنزیر ہیں۔ فلم میں ایسے دہشت گردوں کو دکھایا جاتا ہے جو بقول فلم کے عیسائیوں اور یہودیوں کے دشمن ہیں۔ آخر میں کمنٹری ہوتی ہے کہ اسلام ہماری مغربی تہذیب کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہے۔ لہٰذا مغرب کے اسلامائزیشن کو روکنا ہوگا۔ جو بم شروع میں ٹک ٹک کرتا دکھایا گیا تھا وہ آخر میں پھٹ جاتا ہے اور ایک زبردست شور اٹھتا ہے۔

جب اس فلم پر مسلمانوں کی جانب سے احتجاج کیا گیا تو اس فلم کو آزادی اظہار کے نام پر جائز ٹھہرانے کی کوشش کی گئی۔ عالمی میڈیا سے وابستہ صحافیوں نے مسلمانوں کے احتجاج کی شدید مذمت کی اور ڈچ حکومت نے مسلم ممالک کے مطالبے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مسلمانوں کی صرف اور صرف دلآزاری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا اس لئے اس پر پابندی لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ادھر اس فلم کی حمایت میں مضامین شائع کئے جانے لگے۔ اس کے حوالے سے مسلمانوں اور اسلام کے مزاج کا تجزیہ کیا جانے لگا اور بڑھ چڑھ کر یہ بتانے کی کوشش کی جانے لگی کہ اسلام اور قرآن امن و انسانیت کے دشمن ہیں اور مسلمان تشدد پسند اور قتل و خونریزی کے حامی ہیں۔

جہاں تک گیرٹ وائلڈرس کا تعلق ہے تو وہ اپنے ملک میں ایک مقبول سیاستداں ہے لیکن وہ ایک اسلام دشمن شخص بھی ہے۔ اس سے پہلے بھی اس کی اسلام دشمنی ظاہر ہوئی ہے۔ گذشتہ سال ہی اس نے مطالبہ کیا تھا کہ قرآن پر پابندی عائد کر دی جانی چاہیے۔ یہ اس کا کتنا بڑا دوغلا پن ہے کہ وہ قرآن پر پابندی کا مطالبہ کرتا ہے اور اپنی دلآزار فلم پر پابندی کے اندیشے میں چیخ پڑتا ہے اور چاہتا ہے

کہ اس کی فلم کو پوری دنیا دیکھے۔

وہ تارکین وطن مسلمانوں کے بھی خلاف ہے اور چاہتا ہے کہ ان مسلمانوں کو جو دوسرے ملکوں میں جا کر بس گئے ہیں وہاں سے نکال دیا جائے۔ گذشتہ سال جب اس نے قرآن پر پابندی کا مطالبہ کیا تو ایک مضمون میں یہ بھی لکھا تھا کہ ایک بھی تارک وطن مسلمان کو نہ چھوڑا جائے اور ایک بھی مسجد کو نہ بخشا جائے۔

جب مسلمانوں نے اس فلم کے خلاف آواز بلند کی تو مغربی اخبارات میں فلم کے حق میں مضامین کا سیلاب آ گیا اور آزادی اظہار خیال کے نام پر اس کی حمایت کی جانے لگی۔ یورپی اخباروں میں فلم کی تائید کی جانے لگی اور ان لوگوں کی مخالفت میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جانے لگے جو اس فلم پر پابندی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ فلم پر پابندی نہیں لگائی گئی ہے اور یہ اب بھی ویب سائٹ پر موجود ہے جسے کوئی بھی کسی بھی وقت دیکھ سکتا ہے۔

آزادیٔ اظہار اور بین الاقوامی قوانین:

حالانکہ آزادیٔ اظہار کے نام پر اس فلم کی اور ایسی قابل اعتراض چیزوں کی حمایت کی جاتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے چارٹر اور امریکا و برطانیہ کے قوانین بھی ایسی تضحیک آمیز مہم کی اجازت نہیں دیتے۔ یو این چارٹر کی دفعہ ایل (II) میں بین الاقوامی اقتصادی، سماجی، ثقافتی اور انسانی مسائل کے حل اور بین الاقوامی تعاون کے حصول کی خاطر انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کے احترام کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور بلا امتیاز جنس، نسل، زبان، مذہب اور آزادی جیسے بنیادی انسانی حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس شق کو یوروپی کنونشن کی دفعہ 9 میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

ادھر امریکی دستور میں لکھا ہے کہ کانگریس مذہب کے قیام یا اس کی آزادی

میں رخنہ اندازی یا تقریر اور پریس کی آزادی کو پابہ زنجیر کرنے کے لیے کوئی قانون وضع نہیں کرے گی۔ جبکہ بعض امریکی ریاستوں میں گستاخانہ تضحیک و تذلیل کی روک تھام کے لیے قوانین وضع کیے گئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ جو کوئی بھی خدا کے نام پر دانستہ طور پر گستاخانہ الفاظ ادا کرتا ہے، یا خدا کے بارے میں بدزبانی اور دریدہ دہنی سے کام لیتا ہے یا مقدس صحیفوں میں درج خدائی فرامین کی ہتک اور توہین کرتا ہے تو اسے جیل میں قید کی سزا دی جائے گی۔ دوسری طرف مذاہب کے احترام کے حوالے سے یوروپی عدالت برائے انسانی حقوق نے ایک تاریخی فیصلہ صادر کیا ہے۔ جس میں عدالت نے تحریر و تقریر کی آزادی کے باوجود ہتک عزت قانون کو ایک جمہوری ملک کی ''معاشرتی ضرورت'' قرار دیا ہے۔ Nigel wingnove نے مسیحی تعلیمات اور عقائد کے برعکس ایک توہین آمیز فلم بنائی تھی جس کو عدالت میں چیلنج کیا گیا تھا۔ عدالت نے 25 نومبر 1996 کو اپنے فیصلے میں کہا کہ عدالت آزادئ اظہار رائے کو تسلیم کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اس آزادی کو بھی کچھ حدود و قیود کا پابند ہونا چاہیے۔ مذاہب کے ضمن میں دوسروں کے عقائد کا احترام اور ان کے بارے میں کسی بھی توہین آمیز رویے سے احتراز ایک قانونی و اخلاقی فریضہ ہے۔ حکام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مارکیٹ میں توہین آمیز مواد کی فروخت پر پابندی لگائیں اور اس کے لیے ٹھوس اقدامات کریں۔ اس پابندی سے آئین کے اس آرٹیکل دس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی جس میں آزادئ اظہار رائے کی بات کہی گئی ہے۔

برطانوی عدالتوں نے ایسے متعدد فیصلے سنائے ہیں جن میں دوسروں کے مذاہب کے احترام پر بھی زور دیا گیا ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو قرار واقعی سزا کی ہدایت دی گئی ہے۔ گستاخانہ کلمات اور ہتک عزت مواد کی حوصلہ شکنی

کے لیے بعض دیگر ممالک میں بھی قوانین وضع کئے گئے ہیں۔ یہ ممالک ہیں آسٹریا، فن لینڈ، جرمنی، نیدرلینڈ، اسپین، آئرلینڈ، کناڈا اور نیوزی لینڈ۔ ان قوانین کی موجودگی میں بھی اللہ کے کلام اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کی جارہی ہیں۔ لیکن حکام ان قوانین کو عمل میں نہیں لاتے اور میڈیا کے لوگ ان قوانین سے چشم پوشی کرکے گستاخانِ قرآن و رسولؐ کی پشت پر کھڑے رہتے رہیں۔

❁ ❁ ❁

اہانت آمیز کارٹون اور میڈیا

2006 میں جب ڈنمارک کے اخبارات نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہانت آمیز کارٹونوں کی اشاعت کی تو پوری دنیا میں احتجاج کی آگ لگ گئی اور مسلمانوں نے ناموسِ رسالت کے تحفظ کی خاطر شدید احتجاج کیا۔ یہ احتجاج بعض ممالک میں پرتشدد ہوگیا اور متعدد مسلمانوں کو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔ کارٹونوں کی اشاعت کے سلسلے میں ہندوستان سمیت دنیا بھر کے وہ عناصر جو کہ اسلام مخالف جذبات رکھتے ہیں، بول پڑے کہ کارٹونوں کی اشاعت آزادیٔ اظہار خیال کا ایک حصہ ہے اور کسی کو اسکی مخالفت نہیں کرنی چاہئے۔ تاہم ایسا نہیں ہے کہ تمام مغربی اور یوروپی اخبارات اسلام دشمن جذبات رکھتے ہیں۔ ان میں بعض حق پسند بھی ہیں جنھوں نے ایسے کارٹونوں کی اشاعت کی مخالفت کی۔ ہم یہاں دو قلمکاروں کے خیالات پیش کررہے ہیں جن میں سے ایک امریکن فری پریس سے وابستہ ہیں اور جن کا نام کرسٹوفر بولین ہے اور دوسری خاتون قلمکار ہیں جن کا نام انجیلا فلپس ہے اور جو برطانوی اخبارات سے وابستہ ہیں۔ کرسٹوفر بولین کا کہنا ہے کہ یوروپی میڈیا ''تہذیبوں'' کے ٹکراؤ کے یہودی نظریے کو تقویت فراہم کرنے کے لیے عملاً مسلمانوں کو مشتعل کرتا ہے اور دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی ایک خراب شبیہہ پیش کرتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ آزادیٔ اظہار کے حق کی آڑ میں ڈنمارک کے ایک ممتاز اخبار

نے ایک درجن اسلام مخالف کارٹونوں کی اشاعت کی جس کا واضح مقصد مسلمانوں کی توہین وتذلیل کرنا تھا۔ حسب توقع پر تشدد ردعمل سامنے آیا اور ڈنمارک کو ایک خطرناک صورت حال میں گرفتار کر گیا۔ ڈنمارک کے کثیر الاشاعت روزنامہ اخبار Jyllands- Postan (جے پی) کے ذریعہ اہانت آمیز بارہ کارٹونوں کی اشاعت کے چار ماہ بعد ڈنمارک کے باشندوں کو اس سچائی کا احساس ہوا کہ انہیں تہذیبوں کے ٹکراؤ کو فروغ دینے کی بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔

اشتعال انگیزی کا ایجنٹ:

یونیورسٹی آف کوپن ہیگن کے پروفیسر میخائیل روتھ اسٹین کہتے ہیں ''اسلام مخالف رویے کا مظاہرہ کر کے مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے پیچھے بعض ایجنٹ کارفرما ہیں''۔ دراصل ان میں سے ایک ایجنٹ ہے جے پی اخبار کا ثقافتی ایڈیٹر فلیمنگ روز۔ اس نے اہانت آمیز کارٹون بنوائے اور پھر ان کو اس کثیر الاشاعت اخبار میں شائع کروایا۔ انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون اس سلسلے میں روز کی گوشمالی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ روز ایک طرف آزادئ اظہار کی بات کرتا ہے اور دوسری طرف یہودی لیڈروں اور ان کے جرائم پر نکتہ چینی کرنے میں اس کا قلم رک جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دہشت گردی مخالف جنگ میں روز یہودیوں کا ایک اتحادی ہے۔ جب اس سے اسرائیل کے ارئیل شیرون کے ذریعہ ایک فلسطینی بچے کا گلا گھونٹنے سے متعلق کارٹون کی اشاعت کے سلسلے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ وہ اس کارٹون کو نہیں چھاپ سکتا کیونکہ یہ نسل پرستی ہو جائے گی۔ جب اس سے یہ پوچھا گیا کہ وہ شیرون کا دفاع کیوں کر رہا ہے جو کہ ایک جنگی مجرم کے طور پر جانے جاتے ہیں اور مسلمانوں اور ان کے پیغمبر کو گالیاں کیوں دے رہا ہے تو اس نے بغلیں

جھانکتے ہوئے کہا کہ اس کی بات کو نیویارک ٹائمز اخبار میں غلط طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

فلیمنگ روز نے اکتوبر 2004 میں فلیڈلفیا جاکر بدنام اسلام مخالف قلمکار ڈینیل پائپس سے ملاقات کی تھی۔اس سے ملنے کے بعد روز نے اس کی ستائش میں ایک مضمون قلمبند کیا اور اس نے اسلام کو ملی ٹینٹ اسلام بتایا اور اسے فاشزم اور کمیونزم کے مساوی قرار دیا۔

مسلم ملکوں کا احتجاج:

اہانت آمیز کارٹونوں کی اشاعت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے 26 مسلم ممالک کے وزراء نے ڈینش اخبارات کی مذمت کی اور اسے توہین اسلام قرار دیتے ہوئے ڈنمارک کی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ دوبارہ ان کارٹونوں کی اشاعت نہیں ہوگی۔ جب ڈنمارک کی حکومت نے جو کہ عراق میں پانچ سو فوجی بھیج کر دہشت گردی مخالف جنگ کا ساتھ دے رہی ہے، جارحانہ کارٹونوں پر معافی مانگنے سے انکار کیا تو مشرق وسطی کے عوام نے ڈینش کمپنیوں کی مصنوعات کا بائیکاٹ شروع کردیا اور چند دنوں کے اندر ڈینش برآمدکاروں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ ادھر کوپن ہیگن میں سیاستدانوں کی جانب سے اس نقصان کی تلافی کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ بائیکاٹ کے نتیجے میں ایک ڈینش سویڈش ڈیری کمپنی آرلا فوڈس پر سب سے زیادہ اثر پڑا۔ مشرق وسطی کے مسلم دکانداروں نے اس کی مصنوعات کو اپنی دکانوں سے نکال باہر پھینکا جس کے نتیجے میں اس کمپنی کی مصنوعات کی فروخت ٹھپ پڑ گئی۔ حالانکہ اس کی سالانہ سیل 480 ملین ڈالر تھی۔ کمپنی کے ترجمان ایسٹرڈ گیڈنیلس کے مطابق ہم نے مشرق وسطی میں اپنا بڑا بزنس

قائم کرنے کے لیے چالیس سال صرف کئے تھے اور پانچ دنوں میں ہماری سیل مکمل طور پر ٹھپ ہوگئی۔ ہم ایک ایسے کھیل میں پھنسا دیے گئے ہیں جس میں ہم شریک ہی نہیں تھے۔

ہٹ دھرمی کی انتہا:

ڈینش مصنوعات کے بائیکاٹ اور جے پی اخبار کے دفتر کے باہر بم دھماکے کے خوف کے باوجود فلیمنگ روز کارٹونوں کی اشاعت کے فیصلے پہ قائم رہا۔ اس کو اس پر کوئی افسوس بھی نہیں رہا۔ کارٹونوں کی اشاعت کے اس خطرناک کھیل میں یوروپ کے سات اخبارات بھی شریک ہوگئے اور فرانس، جرمنی، اٹلی، نیدرلینڈ اور سوئزرلینڈ کے اخبارات نے ایک ساتھ ان کارٹونوں کی اشاعت کی۔ ایک پلاننگ کے تحت ایک ہی روز یہ شرارت کی گئی۔ جب پیرس کے اخبار France-Soir کے ایڈیٹر انچیف ارناڈ لیوی سے سوال کیا گیا کہ کیا یوروپی اخباروں نے ایک پلاننگ کے تحت ایک ساتھ اہانت آمیز کارٹونوں کی اشاعت کا فیصلہ کیا تھا، تو انھوں نے اس کا نفی میں جواب دیا، لیکن ان کی بات کسی کے گلے نہیں اتری۔ اگلے روز اس اخبار کے مینجنگ ایڈیٹر جیکس لیفران کو ملازمت سے برطرف کردیا گیا۔ تاہم چیف ایڈیٹر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس اخبار کا مالک ایک مصری ہے۔ جبکہ یوروپی یونین کے ٹریڈ کمشنر پیٹر فنڈیلسن نے اہانت آمیز کارٹونوں کی اشاعت کی پاداش میں یہ کہتے ہوئے اخبار کی سرزنش کی کہ ''اس نے آگ میں پیٹرول ڈالنے کا کام کیا ہے۔''

لیکن پیرس سے سرگرم ایک میڈیا تنظیم رپورٹرس وداوٹ بارڈرس (Reporters without borders) کے سکریٹری جنرل رابرٹ میکنارڈ

نے کارٹونوں کی اشاعت کی حمایت کی۔ اس کا کہنا تھا کہ یوروپ کے تمام ممالک کو ڈینش اخبارات اور اتھارٹی کا ساتھ دینا چاہیے تا کہ اس اصول کا دفاع ہو سکے کہ اخبارات جو چاہیں، لکھیں خواہ اس سے کسی کی تضحیک ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔ انھوں نے نیویارک ٹائمز سے بات چیت میں کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ ان کارٹونوں سے مسلمانوں کو دھچکا لگا ہے لیکن اسے خبریں فراہم کرنے کی قیمت کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہی اخبارات یہودی ہولوکاسٹ پر تمام قوانین وضوابط کی پابندی کرتے ہیں اور کوئی بات نہیں لکھنا چاہتے۔ ہولوکاسٹ کے بارے میں لکھنے اور بولنے کی پاداش میں اس وقت جرمنی اور آسٹریلیا میں چار سرکردہ تاریخ داں جیل میں ہیں۔ یوروپی ایڈیٹر حضرات اس بات سے واقف ہیں کہ اسلام میں بتوں کا استعمال حرام ہے اور پیغمبر اسلام کو تصویر یا امیج کے ذریعہ دکھانا سخت ممنوع اور اہانت آمیز ہے۔ اس کے باوجود ایک گھناونی سازش کے تحت انھوں نے کارٹونوں کی اشاعت کی۔ برطانیہ کے ایک معروف مسلمان نے بی بی سی کو لکھا کہ ڈنمارک کے اخباروں نے ایک جرم کیا ہے اور مسلم برادری کے جذبات کو جان بوجھ کر ٹھیس پہنچائی ہے۔ مسلمان ان لوگوں میں تمیز کرنا جانتے ہیں کہ کون ڈبیٹ کرنا چاہتا ہے اور کون تذلیل کرنا۔ کسی کو بھی ڈبیٹ یا آزادئ اظہار کے نام پر بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔

اسلام مخالف کارٹون اسکینڈل کو ہنس کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فرض کیجیے اگر کہیں دہشت گردانہ حملہ ہوتا ہے اور اس کے لیے کارٹونوں اور مشتعل مسلمانوں کو موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے تو کارٹونوں کی اشاعت کے نتائج آسانی سے سمجھ میں آ جائیں گے۔ اس صورت میں یوروپین اور متحد ہو جائیں گے اور اسلام دشمنی اور بڑھ جائے گی۔ ایک ماہ قبل جب پہلی بار میں مسلم دشمن اور اشتعال انگیز کارٹونوں

سے واقف ہوا تو میں نے فوری طور پر ان اخباروں کے مدیروں سے رابطہ قائم کیا اور ان سے پوچھا کہ آخر انہوں نے ایسی مضحکہ خیز اور اشتعال انگیز صورت حال میں اخباروں کو ڈالنے کی اجازت کیسے دے دی۔ اس پر روز نے، جس نے یہ کارٹون بنوائے تھے، کہا کہ میں آزادیٔ اظہار کی حمایت کرتا ہوں اور سیلف سینسر شپ کے خلاف ہوں۔ تاہم یہ دلیل مناسب نہیں ہے اور نہ ہی اسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ دراصل اس کے پس پردہ یورپین کے مابین تہذیبوں کے ٹکراؤ کا نظریہ ہے۔ میں نے سوال کیا کہ اگر معاملہ واقعی آزادیٔ اظہار کا ہے تو کیا وہ یہودی ہولوکاسٹ پر مزاحیہ اور تضحیک آمیز کارٹون شائع کریں گے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا آپ اخبارات اور عام لوگوں کے اس حق کی حمایت کریں گے کہ وہ ہولوکاسٹ کے بارے میں تاریخی سوالات اٹھا سکیں۔ لیکن ان ایڈیٹروں اور روز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کارٹون تنازعہ اور برطانوی پریس:

جہاں بیشتر یوروپی اخباروں نے توہین آمیز کارٹونوں کی اشاعت کی اور اسے آزادیٔ اظہار کا معاملہ قرار دیا وہیں برطانوی اخبارات کی اکثریت نے آزادیٔ اظہار کی تو حمایت کی لیکن انھوں نے ان کارٹونوں کی اشاعت ضروری نہیں سمجھی اور اس سے احتراز کیا۔ اس سلسلے میں ایک سرکردہ برطانوی صحافی مسز اینجیلا فلپس کا ایک مضمون گارجیئن ڈاٹ کام ڈاٹ یو کے Guardian.com.uk پر موجود ہے۔

اس میں انھوں نے بہت سی قابل ذکر باتیں لکھی ہیں اور بہت سے انکشافات کئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ برطانوی اخبارات مسلمانوں کو مساوی حقوق یافتہ شہری نہیں بلکہ اپنے ملک میں مہمان یا وزیٹر کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے مضمون کی اہم

باتوں کی تلخیص پیش ہے۔

اینجیلا فلپس لکھتی ہیں کہ گریٹر لندن اتھارٹی کی جانب سے ایک رپورٹ جاری کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ برطانوی اخبارات مجموعی طور پر مسلمانوں کو نظرانداز کرتے ہیں اور ان کے ساتھ منفی رویہ اپناتے ہیں۔ مئی 2006 کے ایک ہفتے کے اخبارات کا سروے کیا گیا تو پتہ چلا کہ 325 مضامین میں مسلمانوں کا حوالہ دیا گیا ہے یا ان کے بارے میں لکھا گیا ہے اور ان میں سے صرف چار فیصد کا نقطہ نظر مثبت تھا۔ اتفاق سے میں نے بھی گذشتہ سال برطانوی اخبارات میں مسلمانوں کی کوریج کا جائزہ لیا تھا۔ یہ جائزہ اہانت آمیز کارٹونوں کی کوریج پر ایک بین الاقوامی ریسرچ گروپ کے جائزے کا حصہ تھا۔

کارٹونوں کی عدم اشاعت کا برطانوی پریس کا فیصلہ:

برطانوی اخبارات نے فرانس، فن لینڈ، امریکا اور دوسرے ملکوں کے برعکس ان کارٹونوں کی عدم اشاعت کا فیصلہ کیا۔ البتہ ہر اخبار نے اس سلسلے میں اداریہ لکھا اور ڈنمارک کے اخباروں کے حق اشاعت کی حمایت کی لیکن یہ بھی لکھا کہ ہم نے برطانوی رواداری اور اس ملک میں مسلمانوں کی آبادی کے پیش نظر ان کارٹونوں کو شائع نہیں کیا۔ تاہم ان اخباروں کا نظریہ یہ بھی تھا کہ ہم نے رواداری کے تحت (مسلمانوں کو) اس ملک میں جگہ دی ہے۔ اور انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ ہمارا گھر ہے۔

ہمارے اخبارات رواداری کی بات کرتے ہیں لیکن ہماری نیوز کوریج اور کالموں میں اس رواداری کو مشروط طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو ''اپنے'' ملک میں ایک وزیٹر یا مہمان کے طور پر دیکھتے ہیں، مساوی حقوق یافتہ

شہری کے طور پر نہیں۔ ایک دوسری رائے شماری میں یہ نتیجہ نکالا گیا کہ مسلم برادری اور عام آبادی کے مابین جمہوریت اور قوانین کے تعلق سے مساوی سوچ ہے۔ یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہاں اور ڈنمارک میں بھی اعتدال پسند مسلمانوں سے اس تنازعہ پر ان کے خیالات معلوم کئے جانے چاہئیں۔ لیکن یہاں رپورٹروں نے مسلم برادری کے اعتدال پسند خیالات کو جاننے کی کوئی عملی کوشش نہیں کی۔ گارجیئن اخبار میں ایک انتہا پسند گروپ الغرابہ کے انجم چودھری اور 18 لوگوں کے حوالے دیے گئے جبکہ مسلم کونسل آف گریٹ برٹین کے چیئرسر اقبال سکرانی کو صرف ایک بار کوٹ کیا گیا۔

اہانت آمیز کارٹونوں کے خلاف برطانیہ میں تین مظاہروں کا اہتمام کیا گیا۔ پہلا مظاہرہ پرامن اور منظم تھا۔ لیکن اس میں انتہا پسندانہ تختیاں مظاہرین نے اٹھا رکھی تھیں۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے اسکی بھرپور کوریج کی اور یہ مطالبہ کیا کہ مظاہرین کو یا تو گرفتار کیا جائے یا ان کے ملک واپس بھیجا جائے۔ لیکن جب بیشتر نمائندہ مسلم تنظیموں نے ان اشتعال انگیز تختیوں کی مذمت کی تو اس کو رپورٹ کے بالکل آخر میں دکھایا گیا۔

احتجاج کی کوریج میں بھی تعصب:

جب اعتدال پسند مسلم تنظیموں نے پرامن اور ٹکراؤ سے بچنے والے مظاہروں کا اہتمام کیا تو ان کو کوئی پبلسٹی نہیں ملی۔ ان دنوں میں جو لوگ بھی برطانوی اخبارات کا مطالعہ کرتے تھے، ان کو یہ معلوم ہوا کہ الغرابہ کے لوگ اور بموں کی پیٹیاں کمر میں باندھنے والے ہی برطانیہ میں مسلمانوں کے نمائندہ ہیں۔ تاہم کمنٹ کالموں میں کچھ بہتر صورت حال رہی۔ میں نے چھ برطانوی اخباروں میں

80 کمنٹ کالم گنے۔ ٹائمز اور میل نے ان واقعات پر ایک بھی مسلم کالم نگار کو جگہ نہیں دی۔ ٹیلی گراف نے اپنے کمنٹ پیج پر ایک مسلم کالم نگار کو جگہ دی۔ گارجیئن اور انڈپنڈنٹ نے کچھ اور لوگوں کو جگہ دی۔ (دراصل اس پورے معاملہ پر گارجیئن ہی میں بحث چلی تھی۔) تاہم ان میں مسلم خیالات کی نمائندگی بہت کم دیکھی گئی۔ جبکہ سویڈن ناروے اور فرانس میں پریس میں مسلمانوں کی آواز ذرا تیز رہی۔ انھوں نے تمام مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ آزاد اقدار اور پریس کی آزادی کی خاطر اٹھ کھڑے ہوں۔

میری ریسرچ کے نتائج کے مطابق صحافیوں کی اکثریت خواہ وہ لبرل اخباروں سے وابستہ ہوں یا قدامت پسند اخباروں سے، نمائندگی کے بارے میں زیادہ سوچتی ہے۔ دراصل مسئلہ برطانوی اخباروں کے ٹکراؤ پسند رویے میں پوشیدہ ہے۔ سویڈن میں صحافیوں کی اس سوچ پر نکتہ چینی کی گئی جس کے تحت وہ مسلمانوں کو نمائندگی دیتے ہیں۔ اور جو تھوڑے سے صحافی کمنٹ کالموں میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے وہ بھی مسلمان تھے۔ جبکہ فرانس میں جہاں کارٹونوں کی اشاعت کی گئی تھی اور مسلمانوں کے مظاہرے بھی ہوئے، مظاہروں کی پریس کوریج عام طور پر مثبت رہی۔ اخبارات نے اس پر حکومت کی تعریف کی کہ اس نے اظہار خیال کی آزادی دے رکھی ہے۔

مسلمانوں اور میڈیا پر گریر لندن اتھارٹی کی ریسرچ کا ایک نچوڑ یہ بھی ہے کہ برطانوی صحافت میں مسلمانوں کی نمائندگی بہت ہی کم ہے۔ اگر ان کی بہتر نمائندگی ہوتی تو اہانت آمیز کارٹونوں کی اشاعت سے پیدا شدہ تنازعے سے بہتر طور پر نمٹا جا سکتا تھا۔ ہم یہ بھی یاد دلا دیں کہ مسلمانوں میں مختلف قسم کے نظریات اور عقائد ہیں۔ اب یہی دیکھئے کہ پاکستان میں جن طبقات کے مابین طاقت کی جنگ چل

رہی ہے، ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو جمہوریت پسند ہیں، وہ بھی ہیں جو ملی ٹینٹس کی حمایت کرتے ہیں اور وہ لوگ بھی ہیں جو کہ ایک بنیاد پسند مذہبی ملک چاہتے ہیں۔ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ سب کے سب مسلمان ہیں۔

مذکورہ دونوں قلمکاروں کی تحریروں سے یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح ایک منصوبہ بندی کے تحت ڈینش اخبارات میں توہین آمیز کارٹونوں کی اشاعت کی گئی اور کس طرح پوری دنیا کے مسلمانوں کو مشتعل کرکے ایک خوفناک صورتحال میں پھنسا دیا گیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر دوسرے ممالک کے اخبارات بھی برطانوی اخبارات کی پالیسی اپناتے اور ان کارٹونوں کی اشاعت نہ کرتے تو شاید حالات اتنے دھماکہ خیز نہیں ہوتے۔

امریکی میڈیا اور مسلمان

گیارہ ستمبر 2001 کے بعد مسلمانوں کے بارے میں امریکی میڈیا کا رویہ خاصا جارحانہ ہوگیا ہے اور امریکی الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا مسلمانوں کی اسٹیریو ٹائپ امیج پیش کرتا ہے اور انہیں تشدد پسند، غیر مہذب اور ''جہاد'' کا عاشق دکھاتا ہے۔ آج امریکی میڈیا میں اسامہ بن لادن جیسے لوگوں کو ہی مسلمانوں کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے اور قتل و غارت اور تشدد کو ہی جہاد مانا جارہا ہے۔ امریکا میں مقیم مناریٹ اینڈ دی مسلم آبزرور (minarat and the muslim observer) کے مدیر ڈاکٹر اسلم عبداللہ موجودہ امریکی میڈیا کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ Pew Foundation کے ایک حالیہ سروے کے مطابق بیشتر امریکی پہلے کے مقابلے میں آج اسلام سے زیادہ بدظن ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام امن و انسانیت کا نہیں بلکہ تشدد اور خون خرابے کا مذہب ہے۔ امریکی قارئین، سامعین اور ناظرین کے نزدیک جہاد وہی ہے جو Fox پر براہ راست دکھایا جاتا ہے۔ امریکیوں کے نزدیک مسلمان وہ ہیں جو اسلام کے نام پر لڑتے ہیں اور مرتے مارتے ہیں۔ وہ روزانہ ٹی وی پر مسلمانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ ایک ''عظیم مقصد'' کے لیے دوسروں کا خون بہا رہے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ سچ نہیں ہے۔ وہ دراصل نفرت اور کنفیوژن دیکھتے ہیں۔ یا بعض

معاملات میں دہشت گردوں کے بارے میں حقیقی طور پر نہیں جانتے کہ وہ کون ہیں اور ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ان دہشت گردوں اور انتہا پسندوں نے اسلام کے اصولِ امن کو بدل دیا ہے۔ امریکی ناظرین میڈیا پر ایسے ماہرین کو نہیں سن پاتے جو یہ کہیں کہ دہشت گرد جو کچھ اسلام کے نام پر کر رہے ہیں وہ اسلام نہیں ہے۔ مثال کے طور پر امریکیوں کی اکثریت جہاد کے اصل مفہوم سے لاعلم ہے۔ امریکی عوام اسامہ بن لادن اور اس کے حواریوں کو ٹی وی پر دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہی اسلام کے سفیر ہیں۔ امریکی میڈیا میں خوف و دہشت کی رپورٹیں زیادہ ہیں۔ بعض رپورٹیں سچ ہوتی ہیں اور بیشتر مبالغہ آمیز ہوتی ہیں۔ جہاد کو جس طرح پیش کیا جا رہا ہے، اس سے اسلام کی ایک منفی شبیہ سامنے آتی ہے۔

امریکی میڈیا کے پاس اسلام کے معاملات پر ایکسپرٹس کی بہت کمی ہے۔ خود ساختہ ماہرین ہی کو میڈیا میں پیش کیا جاتا ہے۔ مفادات حاصلہ کے متعدد گروپ ہیں جو اسلام کو مغربی اصول و اقدار کے لیے خطرہ اور مسلمانوں کو مسائل اور پریشانیاں کھڑی کرنے والا بتاتے اور سمجھتے ہیں۔ جبکہ ان میں سے بعض سمجھتے ہیں کہ اصل مسئلہ نام نہاد ''اسلامی بنیاد پرستی'' میں پوشیدہ ہے۔

قابل اعتراض اصطلاحات:

امریکی میڈیا میں اسلامی دہشت گرد، مسلم بنیاد پرست، وہابی متشدد، شیعہ انتہا پسند، سنی بمبار، اسلامی جہادی، عرب قاتل اور اسلامی خودکش بمبار جیسی اصطلاحات فراوانی کے ساتھ استعمال ہوتی ہیں اور سچائی یہی ہے کہ یہ اصطلاحات اتنی قدیم نہیں ہیں جتنا قدیم مذہب اسلام ہے۔ ان نئی اصطلاحات کا مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں کے افعال و کردار کی وضاحت کے لیے استعمال ہوتا ہے، جو تشدد

برپا کرتے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد یہ اصطلاحات امریکی میڈیا میں خاصی مقبول ہو چکی ہیں۔ سی این این، ایف او ایکس، سی بی ایس یا ایم ایس این بی سی کی ہیڈ لائنس میں ان کا استعمال ہوتا ہے اور نیویارک ٹائمز یا لاس اینجلس ٹائمز جیسے اخبارات میں بھی ان کا دھڑلے سے استعمال ہوتا ہے اوران کی مدد سے کامیابی کے ساتھ مسلمانوں کا ایک نیا چہرہ دکھایا جاتا ہے جو کہ ان مسلمانوں سے مختلف ہے جو دہشت گردی کی مذمت کرتے ہیں۔

اگر ہم جائزہ لیں تو پائیں گے کہ تقریباً ہر مذہبی کمیونٹی نے اپنے دہشت گرد، تشدد برپا کرنے والے، نفرت انگیز تقریر کرنے والے اور انتہا پسند پیدا کئے ہیں۔ لیکن مسلم کمیونٹی میں اس قسم کے جو لوگ ہیں ان کو حقیقت سے کہیں زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ گذشتہ پانچ دہائیوں میں دنیا بھر میں تشدد کے ہزاروں واقعات ہوئے ہیں۔ ان میں تمل ٹائیگرس ملوث ہیں جو ہندوازم کا دعویٰ کرتے ہیں، سنہالی انتقام جو بدھ ازم سے تعلق رکھتے ہیں، شیو سینا اور بی جے پی کے کارکن ہیں جو ہندوازم نافذ کرنا چاہتے ہیں، آئرش ریپبلک آرمی کے لوگ ہیں جو کیتھولک ہیں، پروٹسٹینٹ ازم کے حامی السٹر یونین کے لوگ ہیں اور صیہونیت کے پیروکار جیوش ڈیفنس لیگ کے کارکنان ہیں تاہم امریکی میڈیا ان تمام معاملات میں ہندو دہشت گرد، کیتھولک قاتل، پروٹسٹینٹ تشدد پسند یا یہودی انتہا پسند کی اصطلاح اپنی رپورٹوں میں بمشکل استعمال کرتا ہے۔ میڈیا میں تشدد اور مذہب کے مابین رشتے پر بحث نہیں ہوتی۔ مذکورہ تشدد پسندوں اور انتہا پسندوں کے بارے میں اور ان کے مذہب کے تعلق سے کوئی مباحثہ نہیں ہوتا۔ لاطینی امریکا میں تشدد اور خون خرابہ کا ایک طویل ترین دور گزرا ہے۔ اور ان میں بیشتر واقعات میں مذہبی شخصیات اور ادارے ملوث رہے ہیں۔ لیکن جب ان واقعات کا ذکر ہوتا ہے تو عیسائی، یا

کمیونسٹ دہشت گرد کا نہیں بلکہ لبریشن تھیالوجی کی اصطلاح کا استعمال ہوتا ہے۔

مسلمان ویلن:

تشدد اور دہشت گردی کے حوالے سے ہی مسلمانوں اور اسلام کو ویلن بنا کر پیش نہیں کیا جاتا بلکہ حقوق نسواں، انسانی حقوق، بہبودیٔ اطفال، غیر مسلموں سے تعلقات، حب الوطنی اور جمہوریت کے حوالے سے بھی مسلمانوں اور اسلام کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے۔ گیارہ ستمبر کے واقعہ کے بعد میڈیا میں اسلام کو ایک ایسے مذہب کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جس کو اگر ماڈرن دنیا میں باقی رہنا ہے تو اپنے آپ میں تبدیلی لانی ہوگی، مسلمانوں کو اگر زندہ رہنا ہے تو اپنے عقائد بدلنے ہوں گے۔ لیکن عیسائیت، یہودیت، ہندو ازم اور بدھ ازم کو ایسی جارح تنقید کا نشانہ نہیں بنایا جاتا جیسا کہ اسلام کو بنایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان عقائد سے وابستہ لوگ خواہ امریکی اور مغربی دنیا کے خلاف براہ راست تشدد کیوں نہ برپا کر دیں۔ تاہم اب بہت کچھ تبدیلی آ رہی ہے اور مسلمانوں کے احتجاج کے نتیجے میں کچھ محتاط رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آج ہر میڈیا ادارہ مسلمانوں کو اپنے انداز میں پیش کرتا ہے اور مسلمانوں کی جو شکل اسکو سوٹ کرتی ہے اسے دکھاتا ہے۔

میڈیا کوریج کی تقسیم:

گیارہ ستمبر کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے مغربی میڈیا کوریج کو پانچ زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہیں: اطلاعاتی، ستائشی، الزاماتی، اشتعال انگیز اور جارحانہ۔ گیارہ ستمبر کے بعد ہر میڈیا ادارہ انہی پانچوں زمروں کے تحت رپورٹنگ کرتا ہے۔ تقریباً ہر امریکی میڈیا ادارہ اسلام کے بارے میں اپنی سوچ کے تحت اطلاعات فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان میں فرق ہے تو صرف کوریج کے

اسکوپ اور نیچر کا، وہ اپنے قارئین اور سامعین و ناظرین کو یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام کیا ہے اور اس کے نظریات کیا ہیں۔ اطلاعاتی مضامین مجموعی طور پر غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں نصابی کتاب جیسا مواد پیش کرتے ہیں۔

ستائشی مضامین میں ان گروپوں اور اداروں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے جو تشدد اور دہشت گردی کی سختی سے مذمت کرتے ہیں۔ اس کے تحت چھوٹے مسلم گروپوں سے لے کر لاس اینجلس اور پاکستان اور مصر میں موجود بڑی تنظیموں کے نمائندوں کو جگہ دی جاتی ہے۔ میڈیا ادارے مسلم قلمکاروں اور دانشوروں کی خدمات حاصل کرتے ہیں کہ وہ اس مسئلے پر اپنے خیالات اور اسلامی تعلیمات پیش کریں۔

الزاماتی مضامین میں اسلام اور مسلمانوں کی سچی نیت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کئے جاتے ہیں۔ اس زمرے میں ان قلمکاروں اور دانشورں کی خدمات لی جاتی ہیں جن کی اسلام دشمنی جگ ظاہر ہے۔ ان میں سے بیشتر مضامین میں اس پر بحث ہوتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں میں تشدد کے امکانات زیادہ ہیں۔ اشتعال انگیز مضامین میں ان دانشورانہ چیلنجوں پر توجہ دی جاتی ہے، جو مسلمانوں کو ماڈرن دنیا میں اپنے مذہب کی تشریح میں درپیش ہیں۔ اس زمرے کے مضامین میں جمہوریت، انسانی حقوق اور جنسی مساوات سے اسلام کی نام نہاد غیر ہم آہنگی کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ جبکہ جارحانہ مضامین میں ایسے لوگوں کو جگہ دی جاتی ہے جو اسلام کے بارے میں خودساختہ فیصلہ کرتے ہیں۔ آخری تین زمروں کے مضامین انتہائی متنازعہ اور ناقابل قبول ہوتے ہیں۔

شبیہ بگاڑنے کی کوشش:

ایک دوسری قلمکار مسز بینا نے بھی اپنے ایک مضمون میں تقریبا ایسے سوالات

میڈیا کے بارے میں اٹھائے ہیں۔ وہ اپنے مضمون میں سوال کرتی ہیں کہ کیا میڈیا اسلام کی صحیح شبیہ پیش کر رہا ہے؟ وہ سی این بی سی نیوز کی ایک حالیہ رائے شماری کا حوالہ دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ جن لوگوں سے اسلام کے بارے میں سوالات کئے گئے ان میں سے پانچ میں سے ایک حصے سے بھی کم لوگوں نے کہا کہ ان کے خیالات مذہب حامی نہیں ہیں۔ جبکہ 45 فیصد لوگوں نے کہا کہ وہ اسلام پر بھروسہ نہیں کرتے۔ گذشتہ چار برسوں میں ایسا سوچنے والوں میں اضافہ ہوا ہے۔ اب ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ میں یہ مانتی ہوں کہ اس کے لیے میڈیا ذمہ دار ہے۔ اسی نے اسلام کو نفرت سے بھرا ہوا مذہب بنا کر پیش کیا ہے۔ میڈیا کے اثر ورسوخ کے سبب بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک خطرناک مذہب ہے جس میں بے ضرر زندگیوں اور پرامن ماحول کو تباہ و برباد کرنے کی صلاحیتیں ہے۔ ایسے خیالات میڈیا نے لوگوں کے ذہنوں میں ڈالے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک غیر امن پسند مذہب ہے جو کہ تشدد اور خون خرابہ سے بھرا ہوا ہے اور کیوں نہ ہو کہ وہ ''تلوار کے زور پر پھیلا ہے۔'' میڈیا نے ہی یہ شبیہ بنائی ہے کہ اسلام دہشت گردی، خون خرابہ، ظلم وتشدد، ہائی جیکنگ اور خودکش بمباری کا مذہب ہے۔ اس نے جہاد کے بارے میں بھی غلط فہمی پھیلائی ہے۔ میڈیا اسامہ بن لادن سے متعلق رپورٹ کثرت سے دکھاتا ہے اور عوام کے ذہنوں میں یہ تاثر پیدا کرتا ہے کہ یہی لوگ اسلام کے قائد ہیں۔ میڈیا میں اسلام کی اس منفی شبیہ کے نتیجے میں پوری دنیا میں مسلمان متاثر ہیں اور انہیں دہشت گردی کے لیے موردالزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔

لیکن یہ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ چند لوگوں کے غلط کاموں کے لیے پوری مسلم برادری کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ میں ذاتی طور پر میڈیا کی ان مبالغہ آمیز

رپورٹوں کو دیکھنے اور ماننے سے انکار کرتی ہوں جو دن رات پیش کی جارہی ہیں، عوام کو بھی ایسا سوچنا ترک کرنا ہوگا کہ ہر باپردہ عورت اور ہر باریش مسلمان دہشت گرد ہے۔ میڈیا کو اپنی یہ شدید نکتہ چینی بند کرنی ہوگی۔ کیونکہ اسلام ایک امن پسند مذہب ہے۔ عوام کو اسلام کے بارے میں سچائی جاننی چاہیے اور مسلمانوں کے خلاف رائے قائم کرنے سے پہلے اسلامی تعلیمات پر نظر ڈالنی چاہیے۔

ایک دوسرا نقطۂ نظر:

گذشتہ تیس برسوں سے صورت حال کچھ یوں ہے کہ مسلمان اور میڈیا اب ایک دوسرے کے لیے انجان نہیں رہ گئے ہیں بلکہ اب مسلمان اور اسلام کتابوں، کانفرنسوں، مضامین، پی ایچ ڈی مقالوں اور میڈیا میں مباحثوں کے موضوع بن گئے ہیں۔ حالانکہ ان تیس برسوں میں ان کے باہمی رشتوں میں رسہ کشی رہی ہے لیکن اب حالیہ دنوں میں مثبت تبدیلی آرہی ہے۔

ابراہیم ہوپر کونسل آن امریکن اسلامک ریلیشنس (CAIR) کے کمیونی کیشن ڈائریکٹر ہیں اور عائشہ مصطفیٰ ILLIONIS کے ہفت روزہ اخبار ''دی مسلم جرنل'' کی مدیرہ ہیں۔ ویب سائٹ ساونڈ وژن اور ریڈیو اسلام ڈاٹ کام کے ساتھ انٹرویو میں انھوں نے بعض بڑی تبدیلیوں رکاوٹوں اور مسلمانوں اور میڈیا کے لیے آگے بڑھائے جانے والے قدموں پر اظہار خیال کیا ہے۔ ہوپر واشنگٹن میں اپنے دفتر سے انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ چھ سال قبل جب CAIR کی تشکیل ہوئی، اس کے بعد سے ہم نے مسلم کوریج میں ایک اچھی تبدیلی دیکھی ہے۔ اب صحافی ہر ایک پر بنیاد پرست اور ہر ایک پر انتہا پسند ہونے کا لیبل لگانے میں احتیاط برتتے ہیں۔ اب ذاتیات اور اسلام کو یا ذاتی فعل، کسی گروپ کے اقدامات اور اسلام کو الگ

کر کے دیکھنے کی کوشش شروع ہوئی ہے۔ اب وہ عالمی سطح پر مسلم برادری کے مزاج سے واقف ہونے لگے ہیں اور وہ اب اسلام کو لکیر کا فقیر والا مذہب نہیں سمجھتے۔

ہوپر کہتے ہیں کہ اب ایک تبدیلی یہ آئی ہے کہ بیشتر صحافی اور پیشہ ور میڈیا مین اسلام کو ایک عرب مذہب نہیں مانتے۔ اب وہ یہ کہنے لگے ہیں کہ اس میں آفاقی اقدار ہیں۔ جب تک اسلام کو ایک غیر ملکی اور بدیسی مذہب سمجھا جاتا رہا اس وقت تک بہت مشکل تھی۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔

آج مسلمان نہ صرف یہ کہ اسٹیریوٹائپ سے لڑ رہے ہیں بلکہ وہ باہر بھی دیکھ رہے ہیں۔ اب انہیں اس کا احساس ہو رہا ہے کہ کنارے پر بیٹھے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، اس لیے وہ اب بڑھ چڑھ کر میڈیا مین بننے لگے ہیں۔ آج بڑی تعداد میں مسلم میگزین اسلامی اداروں سے نکل رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامک ہورائزنس ISLAMIC HORIZONS اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا کا پبلی کیشن ہے۔ دیگر پبلی کیشنوں کا تعلق مقامی مسجدوں اور مسلم طلبا کی تنظیموں سے ہے۔ وہ ہفت روزہ، ماہنامہ اور سہ ماہی ہیں۔ البتہ ابھی تک ان میں سے کوئی روزنامہ نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن مسلم پبلی کیشنوں کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مسلم جرنل کی عائشہ مصطفیٰ کہتی ہیں کہ مین اسٹریم میڈیا تمام کمیونٹیز کے ایشوز کو مساوی طور پر نہیں اٹھا سکتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اہم معاملات کو مناسب تناظر میں اٹھانے کے لیے اپنے وسائل و ذرائع ہوں۔ مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مسلمانوں کے اچھے کاموں کو دوسروں کے سامنے پیش کریں۔

بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ مسلمانوں اور میڈیا کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ

صحافت اور مواصلات کے شعبوں میں مزید مسلمان داخل ہوں۔ لیکن ہوپر اس سلسلے میں محتاط رویہ اپناتے ہیں۔ وہ انتباہ دیتے ہیں کہ آپ کو بہت محتاط اور ہوشیار رہنا ہے۔ آج مسلم میڈیا کی موجودگی اور مین اسٹریم میڈیا میں مسلمانوں کے ہونے کے باوجود اسٹیریوٹائپس اور تعصب برقرار ہے۔ لہٰذا اس کی ضرورت ہے کہ صحافیوں کو مسلمان سرگرمی کے ساتھ باخبر کریں۔ آج بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اسلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے لیکن اسلام پر رپورٹیں اور مضامین لکھ رہے ہیں اور یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ایسے لوگوں کو اسلام کے بارے میں ایجوکیٹ کریں۔

ہوپر کا کہنا ہے کہ اوکلاہوما شہر میں 1995 میں ہونے والا بم دھماکہ، جو کہ امریکا کے بدترین دھماکوں میں سے ایک تھا، چشم کشا واقعہ ثابت ہوا۔ پہلے اس کے لیے مسلمانوں کی طرف انگلیاں اٹھائی گئیں اور کئی دنوں تک مسلم مخالف پاگل پن جاری رہا۔ لیکن جب اس کا انکشاف ہوا کہ یہ کام کسی مسلمان نے نہیں کیا تو پھر بہت سے صحافیوں کے چہرے پر تھپڑ لگا اور انہیں اپنے تعصب کا احساس ہوا جو کہ اس سے پہلے نہیں تھا۔ میڈیا میں اگر مسلمانوں کے تعلق سے کوئی منفی چیز آتی ہے تو اس پر اپنا نقطۂ نظر پیش کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایڈیٹر کے نام ایک چھوٹا سا خط بھی انقلابی نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ جس طرح دیگر مذاہب اور نسلی گروپ اپنا دفاع کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو بھی اپنا دفاع کرنا چاہیے اور صحافیوں کا ذہن بدلنا چاہیے۔

تاہم ہوپر کہتے ہیں کہ بالی ووڈ ایک ایسا شعبہ ہے جہاں آج بھی مسلمانوں کے تعلق سے کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہ یعنی انٹرٹینمنٹ انڈسٹری مسلم مخالف تعصب کا آخری گڑھ ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے

کہ اس میں حالیہ برسوں میں ابتری ہی آئی ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

امریکا کا سرکاری ریڈیو اسٹیشن وائس آف امریکا ہے جو پچاس سے زائد زبانوں میں اپنی نشریات پیش کرتا ہے۔ اردو نشریات ''ریڈیو آپ کی دنیا وائس آف امریکا'' سے پیش کی جاتی ہیں اور اس سے اکثر و بیشتر امریکا میں مسلمانوں کے بارے میں تفصیلات بھی فراہم کی جاتی ہیں۔ اِن دنوں ''مسلمانوں کا امریکا'' کے عنوان سے ایک نیا سلسلے وار پروگرام پیش کیا جارہا ہے جو اردو اور انگریزی میں نشر ہوتا ہے۔ اس کے تحت یہ بتایا جارہا ہے کہ اسلام بقائے باہم کے اصول کو فروغ دینے والا مذہب ہے اور اس میں صبر و برداشت کی اقدار ہیں۔ اس کے تحت ان مسلمانوں کی خدمات سے دنیا کو روشناس کرانے کی کوشش کی جارہی ہے جو مختلف شعبوں میں رہ کر اسلام کی مثبت تصویر لوگوں کے سامنے رکھنے کی مہم میں مصروف ہیں۔ ان میں مساجد کے امام بھی ہیں اور سماجی کارکن بھی، صوفیا بھی ہیں اور مسلم دانشور بھی۔ اس طرح یہ ایک مثبت پروگرام ہے اور اس کو پیش کرنے والوں کا خیال ہے کہ اس کی مدد سے امریکا میں اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں دور ہوں گی اور لوگ اسلام کی حقیقی تعلیمات سے آگاہ ہوسکیں گے۔

برطانوی میڈیا کی مسلم کورتج

امریکی میڈیا کی مانند برطانوی میڈیا کے ایک بڑے طبقہ کی مسلم کورتج بھی جانبدارانہ اور متعصبانہ ہے اور گیارہ ستمبر کے بعد اس کے رویے میں بھی جارحانہ تبدیلی آئی ہے۔ الیکٹرانک اور پرنٹ دونوں میڈیا میں اسلام کی منفی شکل دکھائی جاتی ہے اور اسامہ بن لادن جیسے لوگوں کو ہی اسلام کے اصل نمائندے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ برطانوی میڈیا کا یہ طبقہ بھی اسلام کو بدنام کرنے کی روش پر چل رہا ہے اور برطانوی مسلمان بھی میڈیا کو اپنا دشمن سمجھنے لگے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے نادرست رپورٹنگ کی جاتی ہے اور اس رپورٹنگ میں لاعلمی کو بھی بڑا دخل رہتا ہے۔

تعصب کی کارفرمائی:

2007 میں اسلامک ہیومن رائٹس کمیشن کے زیر اہتمام برطانیہ میں ایک سروے کیا گیا ہے جس میں برطانوی میڈیا کی مسلم کورتج کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس رپورٹ میں برطانوی میڈیا میں استعمال ہونے والی زبان اور لب و لہجے کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اسلام مخالف رپورٹنگ میں مسلمانوں کے تئیں تعصب کی کارفرمائی ہے۔ 7 جولائی 2005 ءکو ہوئے دھماکوں سے پہلے اور

بعد کی دو ہفتے کی رپورٹنگ کا تجزیہ کیا گیا، تجزیہ کے لیے چار مین اسٹریم نیوز پروگراموں بی بی سی نیوز، نیوز نائٹ، آئی ٹی وی نیوز اور چینل فور کا انتخاب کیا گیا۔ تجزیہ سے پتہ چلا کہ دوسرے ایشوز کے مقابلے میں مسلم ایشوز کو بدنیتی سے پیش کیا گیا۔ 7 جولائی کے حملوں کی روشنی میں یہ باتیں پیش کی گئیں کہ مسلمانوں میں انتہا پسند ہونے کے امکانات زیادہ ہیں اور وہ معاشرہ سے ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتے۔ اسی طرح فلموں میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اسٹیریو ٹائپ امیج دکھائی جاتی ہے۔ برطانوی میڈیا کی مانند برطانوی فلم انڈسٹری بھی اسلاموفوبیا کی شکار ہے۔

اس جائزہ میں مختلف شہروں کے خیالات بھی جاننے کی کوشش کی گئی۔ مانچسٹر میں 73 فیصد، پیٹر بورو میں 70 فیصد، لندن میں 44 فیصد اور بریڈفورڈ میں 62 فیصد مسلمانوں کا خیال ہے کہ میڈیا اسلاموفوبیا کا شکار ہے۔ نوجوانوں کی اکثریت اسی قسم کے خیالات رکھتی ہے۔ جبکہ 63 فیصد خواتین اور 61 فیصد مرد ایسا سوچتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ اسلامی شعائر کی پابند مسلم خواتین کو برطانوی میڈیا شدت سے نشانہ بناتا ہے۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ طبقہ کی اکثریت کا کہنا ہے کہ میڈیا اسلاموفوبیا میں مبتلا ہے۔ برطانوی میڈیا ان مسلمانوں کے تعلق سے زیادہ وحشی اور بے درد ہو جاتا ہے جو مسلم ملکوں میں آباد ہیں۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ وہ لوگ مثبت انداز میں احتجاج کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ اس سروے میں لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ پرنٹ میڈیا کے مقابلے میں الیکٹرانک میڈیا اسلام کو بدنام کرنے میں زیادہ آگے ہے۔ پرنٹ میڈیا کم نقصاندہ ہے۔ کیونکہ الیکٹرانک میڈیا واقعات اور خبروں کے تعلق سے تصاویر کو صحیح تناظر میں نہیں دکھاتا۔ وہ اپنی پسند کے مطابق

ان کو پیش کرتا ہے۔ جبکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ الیکٹرانک میڈیا بہتر ہے کیونکہ ناظرین پیش کردہ حقائق کا بذات خود جائزہ لے سکتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ انٹرنیٹ اطلاعات کی حصولیابی کا معتبر ذریعہ ہے۔ اس کی وجہ اس کی وسعت پذیری ہے۔ لیکن کچھ لوگ انٹرنیٹ پر پیش کی جانے والی اسٹوریز کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔

اسلام کی مقبولیت سے خوفزدہ:

بیشتر رائے دہندگان کے مطابق اسلام امریکا اور برطانیہ سمیت پوری دنیا میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس لیے مادہ پرست مغرب خوفزدہ ہوگیا ہے۔ اس کو اندیشہ ہے کہ اگر اسلام اسی طرح تیزی سے پھیلتا رہا تو اس کی اجارہ داری ختم ہوجائے گی۔ مغرب کے خائف ہونے کی ایک وجہ اسلام کے تعلق سے اس کی لاعلمی بھی ہے۔ اگر وہ اسلام کے بارے میں صحیح حقائق سے واقف ہوجائے تو شاید اس کا خوف دور ہوجائے۔ اسلام کی منفی تصویر کشی کے سبب برطانوی معاشرے میں ایک خلیج بھی پیدا ہو رہی ہے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین دوریاں بڑھ رہی ہیں۔ اس تقسیم کے لیے میڈیا کو ہی ذمہ دار گردانا جارہا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی کوریج سے دو فرقوں میں لاتعلقی پیدا کردی ہے۔

جب مسلمانوں کے خیالات پیش کرنے کا موقع آتا ہے تو برطانوی میڈیا بھی امریکی میڈیا کی مانند انصاف سے کام نہیں لیتا۔ وہ بھی وہ یا تو ایسے لوگوں کو ٹی وی پر پیش کرتا ہے جو انتہا پسند خیالات کے حامل ہوں یا پھر ایسے مسلمانوں کو جو کہ اسلام کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے یا جنھیں مسلمانوں کی اکثریت نہیں جانتی اور اس طرح وہ اسلام کی نمائندگی نہیں کر پاتے۔ اس

رپورٹ میں سفارش کی گئی ہے کہ میڈیا اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں صاف ستھرا موقف اختیار کرے۔ اسلام اور مسلمانوں کی معتبر نمائندگی پیش کرے۔ ایسے رپورٹروں کو مسلمانوں کی کوریج کی ذمہ داری دی جائے جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بہتر معلومات رکھتے ہوں، جو اسلامی ثقافت اور قدروں سے واقف ہوں اور ایسے مسلمانوں سے معلومات حاصل کریں جو بہتر طور پر حالات سے آگاہ ہوں۔ میڈیا کو ایک متوازن رویہ اختیار کرنا ہوگا اور یہ جاننے کی کوشش کرنی ہوگی کہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے اور اسے چاہیے کہ جو جیسا ہے اسے ویسا ہی پیش کرے۔ اسلام کے دیگر پہلوؤں کی بھی کوریج کی جانی چاہیے جیسے کہ آرٹ، کلچر، سائنس اور مسلمانوں کی سائنسی و ترقیاتی خدمات۔ میڈیا میں مسلمانوں کو مزید نمائندگی دی جانی چاہیے تاکہ وہ خود کو بہتر طور پر پیش کر سکیں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں کو متعصبانہ کوریج سے بچائے اور جو لوگ مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلا رہے ہیں ان کے خلاف قانونی کارروائی کرے۔

کوریج کی جھلک:

گیارہ ستمبر کے واقعہ کے بعد برطانیہ میں مسلمانوں کو شدت سے نشانہ بنایا گیا اور برطانوی و مغربی پریس میں مسلم کوریج بڑھ گئی ہے۔ لیکن کوریج کا یہ رنگ زیادہ تر منفی ہے۔ اسی طرح اس کا بھی جائزہ تیز ہوگیا ہے کہ مغربی پریس مسلمانوں کی شبیہ کس طرح بگاڑ رہا ہے اور وہ کس طرح اسلام کو ایک خطرناک مذہب کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ ایک قلمکار ولیم کونٹے نے اپنے ایک مضمون میں اس کا جائزہ لیا ہے۔ یہ مضمون ایک ویب سائٹ پر جس کا نام ”Communications“ ہے،

پوسٹ کیا گیا ہے۔ ولیم کو نئے لکھتے ہیں کہ گیارہ ستمبر کے بعد مسلمانوں کو نشانہ بنانے کا جو رجحان تیز ہوا ہے اس میں برطانوی اور غیر ملکی میڈیا کا بھی ہاتھ ہے بلکہ وہ اس کشیدگی کو اور بڑھا رہا ہے۔ وہ اسامہ بن لادن کو ایک ''جنونی مسلمان'' اور اسلام کو ایک ''خطرناک مذہب'' بنا کر پیش کر رہا ہے۔ میڈیا مشرق وسطی میں عربوں کی ناراضگی کو تو دکھاتا ہے مگر اس کے اسباب کو نظر انداز کرتا ہے۔

برطانوی میڈیا میں مسلمانوں کے تعلق سے اشتعال انگیز زبان استعمال کی جاتی ہے جس کے سبب نسلی یا مذہبی کشیدگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر:- اسامہ بن لادن اور اس کے حامیوں کو ہمیشہ ''مسلم بنیاد پرست، مسلم انتہا پسند، مسلم دہشت گرد اور مسلم جنونی'' کہا جاتا ہے۔ جبکہ دوسروں کے لیے وہ اس قسم کے ایڈجکٹیو استعمال نہیں کرتا۔ آئرش ریپبلکن آرمی کو کیتھولک دہشت گرد نہیں کہا جاتا۔ السٹر فریڈم فائٹرس (Ulster Freedom Fighter) کو پروٹسٹینٹ دہشت گرد نہیں کہتے۔ امریکا کی وہائٹ آرئین ریزسٹنس (White Aryan Resistance) کو کرسچن دہشت گرد نہیں کہتے۔ ساؤتھ افریقہ کی اے ڈبلیو بی کو کالوینسٹ دہشت گرد نہیں کہا جاتا۔ ان تنظیموں کی سرگرمیوں کو ان کے مذہب سے نہیں جوڑا جاتا لیکن جب کوئی تنظیم جس کا تعلق اسلام سے ہو، ایسا کرتی ہے تو فورا مسلم دہشت گرد کہہ دیا جاتا ہے۔

برطانوی میڈیا کو چاہیے کہ وہ اسامہ بن لادن کے ساتھ مسلمان لگانا ترک کرے یا کم از کم یہ بتائے کہ بن لادن کے خیالات اسلام کے دائرے سے باہر ہیں۔ بن لادن ایک (Cult leader) مسلکی لیڈر سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور وہ اپنے تشدد کو مذہب کے ذریعہ جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے اقدامات کو مذہب سے جوڑنا اس کو جواز فراہم کرنا ہوگا۔ لیکن میڈیا ڈیوڈ کوریش

David Koresh کو صرف ڈیوڈین مسلک کا لیڈر کہتا ہے نہ کہ کسی عیسائی گروپ کا۔ شوکو آساہارا Shoko Asahara کو، جس کے اے یوایم Cult کا تعلق جاپانی سب وے میں سرین گیس حملے سے تھا، ہمیشہ ایک Cult لیڈر کہا گیا، نہ کہ ایک دہشت گرد گروپ، جبکہ آساہارا کے مطابق وہ جاپان کو گوتم بدھ کی صحیح تعلیمات پڑھانا چاہتا ہے۔ یوگینڈا کے ''موومنٹ فار دی ریسٹوریشن آف دی ٹن کمانڈمنٹس'' کو میڈیا نے ہمیشہ ایک Cult کہا حالانکہ اس نے اپنے 780 پیرو کاروں کا قتل کر دیا تھا۔ کوریش، آساہارا، اور موومنٹ کے لیڈران صرف جنونی اور دیوانے ہیں جن کو میڈیا ان کے مذاہب کے دائرہ کار سے باہر دیکھتا ہے۔ جبکہ بن لادن کو اسلام کے دائرے میں بتایا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن کی اسکی تشریح راسخ العقیدہ مسلمانوں کی تشریح سے مختلف ہے۔ میڈیا کو چاہیے کہ وہ مسلم، اسلامک یا بن لادن کا حوالہ دیتے وقت لفظ بنیاد پرست کا استعمال ترک کر دے۔ اگر بن لادن اور اس کے حامیوں کو مسلم بنیاد پرست مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کی بنیادیں تشدد، غیر حقیقت پسندی اور پاگل پن میں پیوست ہیں۔ بن لادن کی تعلیمات و تاویلات بنیاد پرست نہیں ہیں۔ دراصل وہ لوگ اسلام کی بنیادوں کو نظر انداز کرتے ہیں جو کہ خدا کی تعلیمات کے تحت ایک پرامن اور پیار محبت والا معاشرہ تشکیل دینے کی بات کرتا ہے۔ بن لادن اور اس جیسے لوگ مسلمان نہیں ہیں۔ اور وہ لوگ یقیناً بنیاد پرست بھی نہیں بلکہ جنونی اور واہمہ پسند ہیں۔ ہم بن لادن کے مسخ شدہ خیالات کو ''صحیح اسلام'' کے طور پر پیش کرتے ہیں جبکہ دیگر مذاہب کے ایسے لیڈروں کو یہودیت اور عیسائیت سے الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ جارج بش دہشت گردی کے خلاف Crusad یعنی صلیبی جنگ کی دھمکی دیتے ہیں۔ صلیبی جنگ لڑنے والے اور ان کے قائدین اسلام کے خلاف اپنی

جنگ کو بائبل سے جواز فراہم کرتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ اگر وہ مارے گئے تو شہید کہلائیں گے اور جنت میں جائیں گے۔ تھومس ایکوینس Thomas Aquinas نے جنگ کا ایک فارمولہ نکالا تھا اور کہا تھا کہ خدا نے خود ان کو فلسطینی شہر اور دوسرے شہروں میں قتل عام کا حکم دیا ہے۔ تاہم جب عیسائی مظالم ڈھاتے ہیں تو میڈیا اور اخبارات ان کی تشریح بائبل سے نہیں کرتے۔

دراصل یہ پریس اور میڈیا کی ذمہ داری ہے کہ وہ غیر جانبدارانہ انداز میں اور جوں کی توں رپورٹنگ کرے۔ ہزاروں اور لاکھوں افراد کے اظہار خیال کے حق کو ذمہ داری اور جوابدہی سے جوڑنا چاہیے اور اظہار خیال کے حق میں تعصب کی کارفرمائی نہیں ہونی چاہیے۔ کسی کے خلاف تعصب خواہ وہ جان بوجھ کر کیا جائے یا انجانے میں، صحافت کو پروپیگنڈہ اور ایک صحافی کو دوسرے کے لیے ضرر رساں بنا دیتا ہے۔ برطانوی میڈیا مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں رپورٹنگ کے دوران جو زبان اور جو تصاویر استعمال کرتا ہے، وہ تناظر سے الگ ہٹ کر ہوتی ہیں۔ حالانکہ دنیا آگے بڑھ رہی ہے اور نئے خیالات پنپ رہے ہیں۔ ہم اسلام کے بارے میں وہی الفاظ آج بھی استعمال کر رہے ہیں جو دس بیس اور تیس چالیس سال قبل استعمال کرتے تھے۔ اگر ہم زبان اور علامتوں کو تبدیل نہیں کر سکتے تو ہم مستقبل کو کیسے بدل سکتے ہیں؟

برطانوی میڈیا کی اسلام مخالف رپورٹنگ پر انگشت نمائی کرنے والے اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو اس بات سے مضطرب ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف گمراہ کن رپورٹنگ کیوں کی جاتی ہے اور اسلام کی حقیقی تصویر کیوں نہیں پیش کی جاتی۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر میڈیا کی مجموعی رپورٹنگ مثبت پہلوؤں کا احاطہ کرے تو مسلم مخالف رجحان میں کمی آ سکتی ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جس طرح

برطانوی اخبارات نے توہین آمیز کارٹونوں کی اشاعت نہ کر کے برطانیہ میں ایک طوفان کو اٹھنے سے پہلے ہی دبا دیا اسی طرح اگر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں منفی کوریج سے احتراز کیا جائے تو حالات میں خوشگوار تبدیلی آ سکتی ہے اور مسلمانوں کے بارے میں لوگوں کی رائیں بدل سکتی ہیں۔

مسلم خواتین مغربی میڈیا کی نظر میں

مسلم خواتین کا موضوع بھی مغربی میڈیا کے لیے ایک پسندیدہ موضوع ہے۔ وہ مسلم خواتین کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جو اسلامی قوانین کے نام پر دبائی اور کچلی جاتی ہیں، جو انتہائی مظلوم اور ستم رسیدہ ہیں اور جن کو انسانی حقوق نہیں دیے جاتے۔ جن کو غلاموں کی طرح رکھا جاتا ہے اور جن پر پردے کا نظام تھوپ کر آزاد معاشرہ سے کاٹ کر الگ تھلگ کر دیا گیا ہے۔ میڈیا مظلوم مسلم عورت کی تصویر کشی کر کے یہ تاثر دیتا ہے کہ ان کو انسانی حقوق اور آزادی دلانا بہت ضروری ہے۔ اسی لیے میڈیا ان آزاد خیال مسلم خواتین کی پشت پناہی اور حمایت کرتا ہے جو مغربی تہذیب کی دلدادہ ہوں۔ امریکا کی سربراہی میں چل رہی انسداد دہشت گردی کی مہم میں مسلم خواتین کو آزادی دلانے کا نعرہ بھی لگایا گیا اور افغانستان پر امریکی حملے کے بعد امریکا کی خاتون اول نے اپنا ''فرض منصبی'' ادا کرتے ہوئے اعلان کیا کہ دہشت گردی مخالف جنگ خواتین کے حقوق اور عزت نفس کی بھی جنگ ہے اور اس بیان کو میڈیا نے خوب دکھایا۔

باؤلنگ گرین اسٹیٹ یونیورسٹی سے وابستہ سمیتا مشرا نے ایک بڑے امریکی اخبار نیویارک ٹائمز کی گیارہ ستمبر 2001 سے گیارہ ستمبر 2003 کی فائل کا جائزہ لیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس ایک سال کے دوران اس اخبار میں مسلم خواتین سے متعلق

مضامین اور رپورٹوں کی اشاعت پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوئی اور ان مضامین اور رپورٹوں میں مسلمانوں کی وہی تصویر پیش کی گئی ہے جس کا ذکر مضمون کے شروع میں کیا گیا ہے۔

مسلم خواتین کے غم میں دبلا میڈیا:

امریکی اور یوروپی اخبارات کو مغربی خواتین کو تفویض حقوق و اختیارات سے کہیں زیادہ دلچسپی مسلم خواتین کو ''با اختیار'' بنانے سے ہے۔ میڈیا اور مغربی معاشرہ مسلم خواتین کو پردے سے باہر لانے میں آج سے نہیں صدیوں سے کوشاں ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ مسلم خواتین کا پردہ، ان کی چادر اور ان کا حجاب ان کی آنکھوں میں چبھ رہا ہے، کھٹک رہا ہے۔ اور یہ کہ جب تک مسلم خواتین کو ''بے پردہ'' نہیں کر دیا جائے گا اس وقت تک ان کو تمام قسم کے حقوق و اختیارات تفویض نہیں کئے جا سکیں گے۔ مغرب کے خیال میں مسلم عورتوں سے ان کا پردہ چھین لینا اس کی بہت بڑی فتح اور اسلام کی بہت بڑی شکست ہوگی۔ حالانکہ بعض ایسے مغربی دانشور بھی ہیں جو اس رجحان کے خلاف ہیں اور کہتے ہیں کہ مغربی میڈیا نے انسانیت اور حقوق نسواں کے نام پر پردے کے خلاف ایک معاندانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے۔

سمیتا مشرا اپنی تحقیق میں بتاتی ہیں کہ ایک سال کے اندر نیویارک ٹائمز میں شائع شدہ 136 مضامین میں مسلم خواتین کا ذکر آیا ہے۔ اس اخبار کے مطابق مسلم خواتین سیاسی تشدد اور اسلامی اصولوں کی شکار ہیں۔ تاہم بعض مضامین میں کہا گیا کہ مسلم خواتین اسلامی ڈھانچے کے اندر تبدیلی اور مزاحمت کی علامت ہیں۔ اس نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ گیارہ ستمبر کے بعد کس طرح امریکا میں مسلم خواتین کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوا ہے۔ مسلم خواتین کی ''آزادی'' کو صارفین کی آزادی سے بھی تعبیر کیا گیا اور اس پر زور دیا گیا کہ ان کو بازاروں اور مارکیٹوں میں

آزادی کے ساتھ جانے اور اپنی پسند کی چیزیں لینے کا حق ملنا چاہیے۔

گمراہ کن کوریج:

یوروپی اور امریکی اخباروں میں مسلم خواتین سے متعلق جو مضامین شائع ہوتے ہیں ان میں بتایا جاتا ہے کہ وہ سیاسی تشدد کی شکار ہیں۔ روانڈا، نائجیریا، بوسنیا، مغربی کنارہ، افغانستان اور صومالیہ وغیرہ کی مسلم خواتین کے بارے میں یہی کہانی پیش کی جاتی ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے مسلم خواتین کی نام نہاد آزادی کو صارفین سے جوڑا جاتا ہے اور خواتین جتنی زیادہ تعداد میں باہر نکلتی ہیں، مغربی میڈیا کے خیال میں انہیں اتنی زیادہ آزادی حاصل ہوتی ہے۔ جب افغانستان پر امریکی فوجوں نے حملہ کیا تو ایک رپورٹر کو مسلم خواتین کی ''آزادی'' کی بو محسوس ہونے لگی۔ کیونکہ اس کے خیال میں کابل کے بازاروں میں بیوٹی سیلون، فیشن ایبل ہیئر اسٹائیل اور آرائش وزیبائش کی دکانوں کی تعداد بڑھ گئی۔ نیویارک ٹائمز کا ایک رپورٹر اپنی رپورٹ میں جہاں ایسی دکانوں کی تعداد میں اضافے پر اپنی خوشی ظاہر کرتا ہے وہیں اسے اس پر بہت رنج اور قلق ہے کہ اب بھی آرائش وزیبائش اور خوبصورتی کا تصور ایک ذاتی اور نجی معاملہ بنا ہوا ہے۔ اس کو اس پر بہت دکھ ہے کہ مسلم معاشرے میں خواتین کا بناؤ سنگار ان کے گھر والوں یا ان کے شوہروں کے لیے ہے دوسروں کے لیے نہیں۔ لیکن جب وہ یہ بیان کرتا ہے کہ آج کابل میں ایسی خواتین کی تعداد بڑھ رہی ہے، جو بغیر برقعہ کے باہر نکل رہی ہیں اور بازاروں میں گھوم رہی ہیں تو اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی۔ مغربی میڈیا جب مسلم خواتین کا ذکر کرتا ہے تو اسکارف، حجاب، چادر اور پردہ جیسے الفاظ کا بھی استعمال کرتا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ ان پردوں

میں دنیا کی دیگر خواتین سے کہیں زیادہ پسماندہ اور پچھڑی ہوئی ہیں۔

میڈیا اسلام کو مردوں کی بالا دستی والا مذہب بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ مردوں کو عوام کے تمام طبقات پر مکمل اتھارٹی حاصل ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اسلام خواتین کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے، ان کے ساتھ امتیاز برتتا ہے اور یہ کہ مسلم معاشرے میں خواتین کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ حالانکہ اس کا یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے۔ پیغمبر اسلام خواتین کے لیے بھی ایک عظیم مصلح بن کر آئے تھے۔ اسلام دنیا کا وہ واحد مذہب ہے جو خواتین کو زبردست حقوق دیتا ہے۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج مسلم معاشرے میں خواتین کو وہ حقوق و اختیارات نہیں مل رہے ہیں جو اسلام نے ان کو دیے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بذات خود اسلام خواتین کے ساتھ امتیاز سے کام لیتا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے اور سیاسی، معاشی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا حق دیا ہے۔ یہاں تک کہ عورتوں کو ووٹ دینے کا حق دیا اور ان کو ترکے میں بھی حصہ دیا گیا ہے۔ لیکن میڈیا مسلم خواتین کی ایک منفی امیج پیش کرتا ہے اور اس کے قارئین، ناظرین اور سامعین اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ مغربی میڈیا یہ نہیں بتاتا کہ تین مسلم ملکوں پاکستان، بنگلہ دیش اور ترکی میں خواتین سربراہ ملک رہ چکی ہیں۔ بلکہ وہ مسلم خواتین کو ایک محروم طبقہ قرار دیتا ہے۔ جس کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ سچ بات یہ ہے کہ مغربی ملکوں میں خواتین کے ساتھ زیادہ ناانصافی اور زیادتی ہوتی ہے لیکن میڈیا اس کو پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

مغربی اور مسلم خواتین کا موازنہ:

مغربی میڈیا جب مسلم خواتین کی بات کرتا ہے تو وہ ایک اور جھوٹ بولتا ہے

کہ مغربی خواتین کو اگر مردوں سے زیادہ نہیں تو کم از کم ان کے مساوی حقوق حاصل ہیں۔ حالانکہ سچائی یہ ہے کہ مسلم خواتین کو مغربی خواتین کے مقابلے میں زیادہ بہتر قانونی حیثیت حاصل ہے۔ مثال کے طور پر مغرب میں مسلم خواتین کے حجاب یا اسکارف کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اسے عورتوں پر ظلم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جبکہ مغربی معاشرے میں ان راہباؤں کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جو کہ خود کو اپنے لباس سے مکمل طور پر ڈھکے رہتی ہیں۔ لیکن جب تقریباً اسی طرح مسلم خواتین مکمل طور پر لباس میں ملبوس نظر آتی ہیں تو ان کو مظلوم بتایا جاتا ہے۔ اس مثال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کس طرح مغربی میڈیا ایک ہی معاملے میں دو الگ الگ پیمانے اپناتا ہے اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ میں کس طرح کامیاب ہے۔ مغربی میڈیا مغربی خواتین کو آزاد اور مسلم خواتین کو استحصال زدہ قرار دیتا ہے جبکہ اگر ہم گہرائی میں جائیں تو مغربی خواتین ہی استحصال زدہ نظر آئیں گی۔ دراصل مسلم خواتین کا باپردہ لباس انہیں احترام اور عزت سے ہمکنار کرتا ہے نہ کہ بے احترامی سے۔

اسی طرح خاندان کے اندر مسلم خواتین کو جو مراعات حاصل ہیں وہ غیر مسلم خواتین کو حاصل نہیں ہیں۔ شریعت کی رو سے مسلم خواتین کو آزادی ہے کہ وہ چاہیں تو گھر کے باہر جاکر کام کریں چاہیں تو نہ کریں۔ اگر وہ کام کرتی ہیں تو ان کو آزادی ہے کہ وہ اپنی آمدنی کو جہاں چاہیں جائز طریقے سے خرچ کرسکتی ہیں۔ شریعت کے مطابق یہ مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ کے اخراجات کا انتظام کرے۔ جبکہ مغربی معاشرے میں دیکھا گیا ہے کہ اگر میاں بیوی دونوں باہر کام کرتے ہیں تو بیوی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ بھی گھریلو بجٹ میں مالی تعاون دے بلکہ اس سے مالی تعاون لیا جاتا ہے۔ بعض معاملات میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مرد گھر میں رہتے

ہیں اور خواتین باہر جا کر کام کرتی ہیں اور گھر خرچ چلانے کی ذمہ داری انہی کی ہوتی ہے۔ اسلام میں عورت کو یہ ذمہ داری دی گئی ہے کہ وہ گھر میں رہے اور اپنے بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی پرورش کرے اور مرد کما کر گھر چلائے۔ مغربی میڈیا اس کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ مسلم خواتین کو معاشرے میں حقوق حاصل ہی نہیں ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مغربی خواتین باہر جا کر اس لیے کام کرتی ہیں کہ وہ شوہر کا ہاتھ بٹا سکیں۔ یہ دلیل بعض معاملات میں تو سچی ہوسکتی ہے لیکن ہر معاملے میں نہیں۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ مغربی ممالک میں عورتوں کو ووٹ اور ملکیت کا حق ابھی بمشکل ایک صدی قبل ہی ملا ہے جبکہ اسلام نے خواتین کو ووٹ اور ملکیت کا حق چودہ سو سال قبل ہی دیدیا ہے۔ مغربی معاشرہ میں عورتوں کو پراپرٹی سمجھا جاتا ہے اور انہیں اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام لگانا پڑتا ہے جبکہ مسلم خواتین کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ چاہیں تو اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام جوڑیں اور چاہیں تو باپ کا نام جوڑیں۔ دراصل میڈیا ان چند مسلمانوں کے رویے کو دیکھ کر اسلام کی تصویر مسخ کر کے پیش کرتا ہے جو خواتین کے ساتھ امتیازی رویہ رکھتے ہیں اور اپنی قبائلی یا ثقافتی قدروں کے سبب ایسا کرتے ہیں۔ یہ بات واضح کی جانی چاہیے کہ ایسے مٹھی بھر مسلمان اسلام کی نمائندگی نہیں کرتے۔ جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اپنی مذہبی کتابوں پر پوری طرح عمل نہیں کرتے۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی کچھ لوگ ہیں۔

حجاب کے فوائد:

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں وہ دوسری تہذیبوں یا مذاہب میں نہیں دیے گئے ہیں۔ اسلام نے درحقیقت خواتین کا درجہ بلند کیا ہے۔

حجاب صرف عورتوں کے لیے نہیں ہے بلکہ ان سے پہلے مردوں کے لیے حجاب کا حکم دیا گیا ہے۔ مردوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ کسی عورت پر پہلی نظر پڑ جائے تو اپنی نگاہ نیچی کرلیں اور دوسری نظر نہ ڈالیں۔ اس کے بعد عورتوں کو نگاہ نیچی رکھنے اور شرمگاہوں کے تحفظ کا حکم دیا گیا۔

حجاب عورتوں کو جہاں بے حیائی سے بچاتا ہے وہیں جنسی استحصال سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ یہ مثال بہت عام ہے کہ اگر دو بہنیں باہر نکلیں اور ان میں سے ایک حجاب میں ہو اور دوسری منی اسکرٹ اور ٹاپ میں تو کوئی منچلا اسکرٹ والی لڑکی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرے گا۔ عورتوں کی عصمت دری کرنے والے کو اسلام میں موت کی سزا کا حکم ہے۔ اس پر بھی مغربی میڈیا ہائے توبہ مچاتا ہے اور کہتا ہے کہ اسلامی سزائیں بہت سخت ہیں اور بربریت پر مبنی ہیں۔ لیکن اگر مغرب کے کسی شخص سے پوچھا جائے کہ اگر کوئی شخص اس کی بہن، بیٹی یا بیوی کی عزت لوٹ لے تو وہ کیا کرے گا۔ اس کا فوری جواب یہی ہوگا کہ وہ زانی کو مار ڈالے گا۔ بلکہ بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ایسے شخص کو تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔ لیکن جب اسلام موت کی سزا کا حکم دیتا ہے تو اسے بربریت پر مبنی قرار دے کر اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔

اعداد و شمار کے مطابق مسلم ملکوں کے مقابلے میں امریکا اور برطانیہ میں عصمت دری کے واقعات زیادہ ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ واقعات امریکا میں ہوتے ہیں۔ ایف بی آئی رپورٹ کے مطابق امریکا میں 1990 میں عصمت دری کے یومیہ 1756 واقعات ہوئے تھے اور بعد میں اس شرح میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایک رپورٹ کے مطابق بعد کے سالوں میں یہ تعداد 1900 اور اس سے بھی زیادہ ہوگئی۔ اگر امریکا یا یوروپ میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہوجائے تو بلاشبہ وہاں کی خواتین کو جنسی استحصال سے بہت حد تک نجات مل جائے گی۔

عورت اور قدیم تہذیب:

اگر ہم تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ماضی میں عورتوں کو عیش وعشرت کا سامان سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہی لونیئن تہذیب میں قوانین کی رو سے عورتوں کو کسی بھی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت کو قتل کردیتا تھا تو اسے سزا دینے کے بجائے اس کی بیوی کو قتل کردیا جاتا تھا۔ یونانی تہذیب کو بہت ہی درخشاں تہذیب کہا جاتا ہے۔ لیکن اس میں بھی عورتوں کو کوئی عزت حاصل نہیں تھی۔ یونانی روایت کے مطابق ایک خیالی عورت کو جس کا نام ''پنڈورا'' تھا، عذاب اور بدبختی کی جڑ سمجھا جاتا تھا۔ یونان میں عورتوں کو دوسرے درجے کا انسان سمجھا جاتا تھا اور معاشرے میں جسم فروشی ایک عام وبا کی شکل اختیار کرگئی تھی۔ اسی طرح رومی تہذیب میں بھی عورتوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ کسی بھی مرد کو اپنی بیوی کی جان لینے کا اختیار تھا۔ رومیوں میں جسم فروشی اور عریانیت عام بات تھی۔ مصری تہذیب میں عورتوں کو برائی اور شیطان کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اور عرب میں اسلام کی آمد سے قبل عورتوں کو عیش وعشرت کی چیز بنادیا گیا تھا اور بچی کی پیدائش پر اس کو زندہ دفن کردیا جاتا تھا۔

مغربی خواتین کا قبول اسلام:

لیکن آج میڈیا کے ذریعہ مسلم خواتین کے خلاف پرچار اور پروپیگنڈہ کے باوجود مغربی ملکوں میں بہت سی عورتیں اسلام قبول کررہی ہیں۔ برطانیہ میں ایسی خواتین کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے جو اسلام کے دامن میں پناہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ قبول اسلام کی شرح میں اضافہ کے پیش نظر یہ پیشین گوئی کی جانے لگی ہے کہ اسلام بہت جلد برطانیہ کا ایک انتہائی اہم مذہب بن جائے گا۔ برطانیہ کی ایک مذہبی استاد

اور قرآن کے بارے میں گائڈ بک کی مصنف روز کینڈرک Rose Kondrick کہتی ہیں کہ آئندہ بیس برسوں میں قبول اسلام کرنے والوں کی تعداد دوسرے ملکوں سے یہاں آنے والے مسلمانوں کی تعداد کے مساوی یا اس سے زیادہ ہو جائے گی۔ لوسی بیرنگٹن (Lucy Berrington) کے مطابق اسلام مخالف میڈیا کوریج کے باوجود اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سلمان رشدی تنازعہ، خلیجی جنگ اور بوسنیائی مسلمانوں کی زبوں حالی قبول اسلام کے بڑے اسباب میں شامل ہیں۔ مغرب میں ایسا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ اسلام میں عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے اس کے باوجود برطانیہ میں خواتین سب سے زیادہ اسلام کی طرف جھک رہی ہیں۔ امریکا میں بھی یہی صورت حال ہے۔ وہاں اگر ایک مرد مسلمان ہو رہا ہے تو چار عورتیں اسلام قبول کر رہی ہیں۔ برطانیہ میں گذشتہ چند برسوں میں تقریباً بیس ہزار کے قریب لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

برطانیہ کے شہر لیسٹر (Leicester) میں ایک سروے کیا گیا ہے جس کے مطابق اسلام قبول کرنے والوں کی عمر تیس سے پچاس سال کے مابین ہے۔ پندرہ سال قبل اسلام قبول کرنے والی ایک امریکی ماہر نفسیات عالیہ ہائری کہتی ہیں کہ مغرب میں اسلام کی روشنی پھوٹ رہی ہے اور ہمارے دور میں بہت سے لوگ اس روشنی سے استفادہ کر رہے ہیں۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ جو مغربی باشندے اسلام کی طرف آ رہے ہیں وہ نئی سوچ اور نئے ذہن کے ساتھ آ رہے ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مذہب کی تقابلی تعلیم کے سبب بھی بہت سے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ برطانوی میڈیا کی منفی رپورٹنگ بھی اس میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔ مغربی معاشرے میں متعدد قسم کی برائیوں اور جرائم سے پریشان لوگ اسلام میں آ کر خود کو محفوظ محسوس کر رہے ہیں۔ بہت سی ایسی عورتوں کو بھی جو مذہبی

اعتبار سے عیسائی تھیں اسلام میں آسودگی حاصل ہو رہی ہے۔ روز کنیڈرک کے مطابق میں تھیالوجی کی طالبہ تھی اور تعلیمی قابلیت و لیاقت کے سبب میں نے اسلام قبول کیا۔ یعنی جب اس نے اسلام کا مطالبہ کیا تو اسے سب سے اچھا مذہب پایا۔ اسی طرح 39 سالہ میمونہ بھی ایک مذہبی عیسائی تھی مگر اس کو بھی اس مذہب میں آسودگی حاصل نہیں ہوئی اور اس نے اسلام کے دامن میں پناہ ڈھونڈ لی۔

مسلم لڑکیوں میں اعلیٰ تعلیم کا رجحان بھی بہت تیزی کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے اور جہاں مسلم دوشیزائیں بڑی تعداد میں عالمہ بن رہی ہیں وہیں وہ ڈاکٹر، انجینئر، ماہر معاشیات، پائلٹ اور صحافی بھی بن رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ مسلم لڑکیوں میں اسلامی جذبہ بھی پروان چڑھ رہا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مغربی میڈیا کو ایسی اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلم خواتین نظر نہیں آتیں۔ ہاں اگر کوئی خاتون مغربی تہذیب کی نمائندہ ہو تو وہ فوراً نظروں میں آ جاتی ہے اور میڈیا اسکی تعریف و ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگتا ہے۔

❀❀❀

تہذیبوں کا ٹکراؤ اور میڈیا کا رول

جون 2008 میں مکہ مکرمہ میں منعقدہ بین المذاہب مذاکرات سے متعلق عالمی کانفرنس میں یہ اپیل کی گئی کہ امن اور رواداری کی تہذیب کو فروغ دینے کے لیے بلالحاظ رنگ ونسل اور ملک و مذہب متحد ہوکر کام کیا جائے۔ اس وقت دنیا کو بے شمار خطرات اور چیلنجوں کا سامنا ہے اور یہاں تک کہ انسانی وجود بھی خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اسلام دنیا کو درپیش تمام مسائل ومصائب اور مشکلات کا حل پیش کرتا ہے اور پوری دنیا کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دیگر اقوام کے ساتھ مل کر عالمی مسائل کا حل تلاش کریں۔

اس وقت جبکہ امریکی مفکر سیموئیل ہنگٹن کے نظریہ ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' پر پوری دنیا میں بحث چھڑی ہوئی ہے اور تعلیم یافتہ اور دانشوروں کا طبقہ دو خیموں میں تقسیم ہوگیا ہے، اس کانفرنس کی زبردست اہمیت ہے۔ مذکورہ نظریہ کے برعکس کانفرنس میں تہذیبوں کے مابین مذاکرات کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا گیا اور مکہ اعلانیہ میں مشترکہ اقدار پر اتفاق رائے، افہام وتفہیم پر مبنی مکالمہ اور فہم وفراست پر مشتمل منصفانہ مذاکرات سے دلوں کو جیتنے کی اپیل کی گئی۔ اعلان مکہ میں انصاف اور اخلاق کے فروغ کے ساتھ ساتھ پرامن بقائے باہم کے نظریہ کی بالادستی کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا۔ اس کے علاوہ زمین پر جنگ وجدال کے

بجائے امن کے قیام کی اہمیت اجاگر کی گئی اور کہا گیا کہ دنیا کو ایسی ترقی کی ضرورت ہے جس کی تکمیل تباہی و بربادی سے نہیں بلکہ انسانیت کی فلاح و بہبود سے ہوتی ہو۔ کانفرنس میں مسلمانوں اور عیسائیوں، مسلمانوں اور یہودیوں اور مسلمانوں اور مغرب کے مابین مذاکرات پر زور دیا گیا۔ بلاشبہ موجودہ وقت میں یہ ایک انتہائی اہم کانفرنس تھی۔ اس کی سفارشات کو پوری دنیا میں عام کرنے اور ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

اس وقت دنیا میں ایسے متعدد ادارے ہیں جو مذکورہ عقائد کے مابین مذاکرات یا یوں کہیں کہ تہذیبی مذاکرات کے لیے کام کر رہے ہیں تاکہ بین المذاہب کشیدگی کا خاتمہ ہو اور پر امن بقائے باہم کے نظریہ کو فروغ حاصل ہو۔ 2006 میں پوپ بینڈکٹ کے ذریعہ اسلام کے بارے میں قابل اعتراض بیان دینے کے بعد کیتھولک حکام اور 138 مسلم اسکالروں کا ایک اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ایک مسلم کیتھولک فورم قائم کیا جائے۔ پوپ اس پر راضی ہو گئے اور نومبر میں روم میں اس فورم کا پہلا اجلاس ہوگا۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد ایک مسلم عیسائی فورم بھی تشکیل دیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر عالمی فورموں اور تنظیموں سے بین المذاہب مکالمہ یا تہذیبی مذاکرات کو تیز کرنے کی کوشش کی جائے تو فضائے امن پر چھائے ہوئے اس غبار کو صاف کرنے میں مدد مل سکتی ہے جو ہنٹنگٹن کے نظریہ نے پیدا کر دیا ہے۔

کیا ہے ہنٹنگٹن کا نظریہ:

پہلے دیکھتے ہیں کہ یہ نظریہ کب پیش کیا گیا اور اس میں کیا کہا گیا ہے۔ سیموئیل ہنٹنگٹن نے 1993 میں تہذیبوں کے مابین تصادم کے عنوان سے سہ ماہی جریدہ

فارن افیئرس میں ایک مضمون لکھا جو بعد میں کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ کتابی شکل میں شائع ہوا اور اس کتاب کا نام "تہذیبوں کا ٹکراؤ اور دنیا کی تشکیل نو" رکھا گیا۔ یہ کتاب 1996 میں منظر عام پر آئی اور اس وقت سے اس پر بحث ومباحثے کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ عالمی سیاست کثیر قطبی بھی ہے اور کثیر تہذیبی بھی۔ تہذیبوں کے جھکاؤ کے مابین طاقت کے توازن کے طور پر مغربی اثر ونفوذ میں کمی آرہی ہے۔ آئندہ دہائیاں مغربی عروج کی ہوں گی۔ اس کے بعد اس کا زوال شروع ہو جائے گا۔ مغربی تہذیب زوال کی طرف جارہی ہے اور اسلامی اور کنفیوشس (چینی) تہذیبیں اس کے لیے اصل چیلنج ثابت ہوں گی، تہذیبوں کی جنگ نئی صدی کی جنگ ہوگی ممکن ہے کہ 2015 میں عالمی تہذیبی جنگ ہو جائے۔ تاہم اگر مغربی حکومتیں بحرانوں سے نبرد آزما ہوسکیں، تصادم کے اسباب کا انسداد کرسکیں اور ایٹمی اسلحہ پر قبضہ کی دوڑ کا خاتمہ کرسکیں تو اس ممکنہ جنگ کو ٹالا جاسکتا ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایک ایسا عالمی نظام ابھر رہا ہے جس کی بنیاد تہذیبوں پر مبنی ہوگی۔ اگر مغرب کو زندہ رہنا ہے تو امریکا کو اپنی مغربی شناخت پر سختی سے کاربند رہنے کا اعادہ کرنا ہوگا اور دیگر تہذیبوں کے چیلنجوں کے سامنے دیگر مغربی طاقتوں کے ساتھ متحد رہنا ہوگا۔

(ہنٹنگٹن کی طرح ایک اور جاپانی نژاد امریکی مفکر فوکویاما نے بھی ایک نظریہ پیش کیا ہے جس کا عنوان ہے "تاریخ کا خاتمہ اور آخری آدمی"۔ اس میں وہ مغرب کی بے لگام جمہوریت کی فتح اور مغربی طاقت وقوت کے انتہا کو پہنچنے کے بعد موجودہ دنیا اور مستقبل کی دنیا کا ایک نیا تصور پیش کرتا ہے جو آزاد سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ہوگا۔ فوکویاما نے اس نظام کے غلبہ اور اس کے دائرہ کار کو وسعت دینے کے لیے اسلام کی تاریخ کو نظر انداز کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی ثقافت کے دائرے سے باہر کی

دنیا میں اسلام اپنی کشش کھو چکا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اسلامی ثقافت رکھنے والے تقریباً ایک ارب مسلمان فکری اور نظریاتی سطح پر آزاد جمہوریت کو چیلنج کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔) فوکویاما کے اس نظریہ پر بھی عالمی سطح پر بحث جاری ہے۔

ہنٹنگٹن نے اسلامی اور چینی تہذیب کو مغربی تہذیب کے لیے خطرہ قرار دیا ہے۔ اس کی رائے ہے کہ ان دونوں تہذیبوں کی عسکری طاقت کو کم کیا جائے، تہذیبوں کے علمبردار ملکوں کے موجودہ اختلافات و تنازعات سے فائدہ اٹھایا جائے اور مغربی تہذیب کے ساتھ تعاون کرنے والی دیگر تہذیبوں کی حمایت حاصل کی جائے۔

میڈیا کے رول کا جائزہ:

تہذیبوں کے مابین تصادم کے اس نظریہ کو ایک حلقہ مسترد کرتا ہے اور دوسرا حلقہ تسلیم کرتا ہے۔ اس کو عالمی سطح پر روشناس کرانے میں ہنٹنگٹن کی کوششوں کے ساتھ میڈیا نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ میڈیا کا ایک بڑا طبقہ اس نظریہ کا حامی ہے۔ دنیا میں دو سپر پاورس کی موجودگی کے وقت جس طرح سرد جنگ سیاست چل رہی تھی اسی طرح سرد جنگ صحافت بھی ہو رہی تھی اور صحافیوں کا ایک حلقہ امریکا کے اس نظریہ کا پروپیگنڈہ کرتا تھا کہ ماسکو میں بیٹھے ہوئے لوگ غلط اور برے ہیں اور واشنگٹن میں بیٹھے ہوئے لوگ اچھے ہیں۔ وہ اسی نظریہ کی روشنی میں صحافتی کوریج کے خدوخال متعین کرتے تھے۔

Marquette یونیورسٹی میں صحافت کے استاد اور متعدد کتابوں کے مصنف پروفیسر فلپ صائب (Philip Seib) کہتے ہیں کہ ”دیوار برلن کے انہدام، سوویت یونین کے زوال اور سرد جنگ کے خاتمے کی دیگر محرکات کے بعد نیوز میڈیا

نے انٹرنیشنل کوریج کے لیے ایک نئے راستے کی تلاش شروع کردی۔ نیویارک ٹائمز کے فارن ایڈیٹر Bernord Gwertzman نے دسمبر 1992 میں اپنے اسٹاف کو یہ ہدایت نامہ ارسال کیا کہ ''بیتے دنوں میں جب متعدد ممالک سرد جنگ کے مہرے تھے تو ان کی سیاسی سوچ اور سمت ان کی کوریج کے لیے ایک بڑی وجہ تھی۔ لیکن اب جبکہ ان کی سیاسی سمت و رفتار کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے تب بھی ہم کو انہیں بھولنا نہیں چاہیے۔ لیکن ہمیں ایک ایسی سوسائٹی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کا موقع ملا ہے جو اپنے آپ میں مکمل ہے۔''

فلپ صائب مزید کہتے ہیں کہ سرد جنگ کے بعد نیوز میڈیا وقتاً فوقتاً ایسے ویلن کی تلاش کرتا رہا جس کی کوریج کر سکے۔ صدام حسین نے بھی کچھ دنوں تک سرد جنگ کے خاتمے سے پیدا شدہ صحافتی خلاء کو پر کئے رکھا۔ اس کے بعد متعدد واقعات ہوئے، خلیجی جنگ ہوئی، 1993 میں نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں کار بم دھماکہ ہوا جس میں سات افراد ہلاک اور سینکڑوں زخمی ہوئے تھے۔ 1995 میں درجنوں امریکی طیاروں کو اڑانے کی سازش ناکام کی گئی، 96-1995 میں سعودی عرب میں امریکی ٹریننگ اور رہائشی سہولیات کو نشانہ بنایا گیا۔ ان کے علاوہ بھی دیگر دہشت گردانہ واقعات ہوئے۔ لیکن گیارہ ستمبر 2001 کے دہشت گردانہ حملوں نے امریکی حکمت عملی میں بڑی تبدیلی پیدا کی۔ اس کے بعد امریکی نیوز اداروں نے ایسی سرخیاں لگائیں کہ امریکی حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان، امریکا کے سیاہ مستقبل کی پیشین گوئی، وغیرہ وغیرہ۔ گویا میڈیا اداروں نے اپنی کوریج سے ہنٹنگٹن کے نظریہ کی تائید کی۔

ٹکراؤ مخالف حلقہ کے دلائل:

بعض میڈیا اداروں نے اس وقت امریکا اور انقلابی مسلمانوں کے مابین

جاری تصادم کو تہذیبوں کے ٹکراؤ سے تعبیر کیا ہے۔ جبکہ دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ یہ اسلام بمقابلہ امریکا یا اسلام بمقابلہ مغرب صورت حال نہیں ہے بلکہ اسلام کے اندر ایک انقلابی گروپ کا مغرب سے تصادم ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے ایک اسکالر Charles Kupchan کہتے ہیں کہ ''امریکا اور انقلابیوں کے مابین جاری ٹکراؤ تہذیبوں کے ٹکراؤ کی نمائندگی نہیں کرتا۔ ایک امریکی صحافی تھامس فرائڈمین بھی اس نظریہ کی تائید نہیں کرتا۔ اس کا کہنا ہے کہ ہننگٹن نے ثقافتی مفادات اور رویے پر گلوبلائزیشن کے اثرات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ پروفیسر ادیب دویشا (Adeeb Dawisha) کے مطابق سیاست کی مانند نیوز کوریج میں بھی اگر کوئی دشمن نہیں ہے تو ایک خلاء موجود رہتا ہے۔ کمیونزم کے خاتمے کے بعد مغرب نے اسلام کو اپنے لیے شاید سب سے زیادہ خطرناک دشمن سمجھ لیا۔ اس طرح جب ایک دشمن پیدا ہو گیا تو خلاء خود بخود پر ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ 2001 کے حملے کے نتیجے میں امریکی میڈیا اداروں نے ایسی سرخیاں لگائیں! یہ ایک مذہبی جنگ ہے، جی ہاں یہی اسلام ہے، یہ مسلم غم و غصہ ہے، اسلامی دہشت کی دانشورانہ جڑیں، جہاد 101 اور اسلام کی بغاوت وغیرہ وغیرہ۔ متعدد اخبارات نے اسے کروسیڈ سے تعبیر کیا۔ ایسے متعدد واقعات کی روشنی میں ہننگٹن کے نظریہ کو تقویت حاصل ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے جو اس نظریہ کے سخت مخالف ہیں۔ معروف دانشور ایڈورڈ سعید کلیش آف سیولائزیشن کو کلیش آف اگنورنس قرار دیتے ہیں۔ یعنی ان کے مطابق یہ تہذیبوں کے ٹکراؤ کا نظریہ نہیں بلکہ لاعلمی اور جہالت کے ٹکراؤ کا نظریہ ہے۔ ایڈورڈ سعید کا مزید کہنا ہے کہ ہننگٹن نے تہذیب اور مغرب جیسے دور از کار اور بے جان تصورات کا استعمال کیا ہے۔ گویا کہ مغرب تنہا ایک تہذیبی وجود ہے۔ حالانکہ خود مغرب میں کئی تہذیبیں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح خود اسلامی تہذیب کی

متعدد صورتیں ہیں اور مختلف سیاسی اور ذیلی گروپ اسلام کے سلسلے میں مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ اس لیے تہذیبوں کو کسی مخصوص اور متعین مفہوم میں استعمال کرنا سنگین غلطیوں میں سے ایک ہے۔ ان کے خیال میں ہننگٹن نے صحافت کے ثانوی اور سطحی ذرائع اور آراء پر اعتماد کیا ہے، نہ کہ تہذیبوں اور ثقافتوں کی حقیقی صورت حال کے گہرے مطالعہ پر۔ ادھر ڈاکٹر عبداللہ العروی کہتے ہیں کہ ''وہ تمام تصورات جن سے تصادم پیدا ہوسکتا تھا، جیسے کہ زبان، ملک، قومیت، شہنشاہیت اور دیگر نظریات اب ختم ہو چکے ہیں۔ لہذا ہننگٹن کے سامنے ایک ہی راستہ بچا تھا کہ وہ تہذیب وثقافت کو تصادم کا سبب قرار دے''۔ علمی اور اسلامی حلقوں میں اس نظریہ پر نکتہ چینی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ نظریہ تہذیبوں کے مابین مذاکرات کی نفی کرتا ہے۔ یہ تہذیبی تاریخ کے تقابلی مطالعہ اور تحقیقات کی ضد ہے، یہ جنگ اور کشمکش کی دعوت دیتا ہے، جبکہ اسلام نے ہمیشہ تصادم اور ٹکراؤ کے مقابلے میں مذاکرات کو ترجیح دی ہے، جنگ کے مقابلے میں تبلیغ کو پسند کیا ہے اور جبر وتشدد کے بجائے، محبت اور بہی خواہی کو اپنایا ہے۔

تہذیبی ماہروں اور دانشوروں کا حلقہ اس پر زور دیتا ہے کہ تہذیبیں کبھی آپس میں نہیں ٹکراتیں۔ ان میں تصادم اور ٹکراؤ کے نہیں بلکہ افہام وتفہیم اور مکالمہ ومذاکرہ کے عناصر موجود ہیں۔ تہذیبی اکائیاں بات چیت پر زور دیتی ہیں، کشمکش اور تصادم پر نہیں۔ جب تہذیبیں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتی ہیں تو وہ ایک دوسرے کی اچھائیوں اور خوبیوں کا تبادلہ کرتی ہیں۔ گمراہ کن اور بگڑے ذہنوں کا فتور تہذیبوں کے مابین ٹکراؤ کی بات کرتا ہے۔ جبکہ تہذیبیں پرامن بقائے باہم کا ماحول پیدا کرتی ہیں۔ تاریخ میں بین المذاہب مذاکرات اور تہذیبوں کے درمیان باہمی تعلقات کی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔ لہذا اس نظریہ کی کسی بھی

قیمت پر تائید وحمایت نہیں کی جاسکتی۔

انٹرنیٹ کا ممکنہ کردار:

تہذیبی مذاکرات کو فروغ دینے میں میڈیا انتہائی اہم رول ادا کرسکتا ہے۔ اگر وہ خلاء کو پر کرنے کے لیے کسی دشمن کے بجائے دوست کا استعمال کرے تو دنیا میں ایک ایسی فضاء بنائی جاسکتی ہے جس میں تہذیبوں کے مابین ٹکراؤ کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس سلسلے میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم الیکٹرانک میڈیا کے ایک میڈیم یعنی انٹرنیٹ سے اس سلسلے میں کافی کام لیا جاسکتا ہے۔ وہ لوگ کافی معاون ثابت ہوسکتے ہیں جن کے ہاتھوں میں اطلاعات کا بہاؤ ہو یا جو اطلاعات کو کنٹرول کرنے کے اختیارات سے لیس ہوں۔ انٹرنیٹ ایک دوسرے سے ناواقف تہذیبوں کے اتصال کا ایک اہم ذریعہ بن سکتا ہے۔ سائبر اسپیس ایک ایسی اسپیس ہے جہاں سب کو آزادی کے ساتھ اپنے نظریات پیش کرنے اور ان پر بحث ومباحثہ کو آگے بڑھانے کے اختیارات اور وسائل حاصل ہیں۔ اس میڈیم کے ذریعہ اسلامی تہذیب کو بھی دنیا کے سامنے موثر انداز میں رکھا جاسکتا ہے۔

گذشتہ چند برسوں میں عالم اسلام میں انٹرنیٹ کے استعمال میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہوا ہے۔ تاہم دنیا کے دیگر ملکوں کے مقابلے میں اسلامی ممالک کے لوگ انٹرنیٹ کے استعمال میں بہت پیچھے ہیں۔ سب سے زیادہ انٹرنیٹ استعمال کرنے والے 25 ملکوں کی فہرست میں ایک بھی اسلامی ملک نہیں ہے۔ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کو چھوڑ کر صرف پانچ فیصد آبادی انٹرنیٹ استعمال کرتی ہے۔ مسلم اکثریتی ملکوں میں یہ شرح اور بھی کم ہے۔ مثال کے طور پر انڈونیشیا میں 3.6 فیصد

اور پاکستان میں ایک فیصد آبادی انٹرنیٹ استعمال کرتی ہے۔ اگر 2000 سے 2004 کے مابین انٹرنیٹ کے استعمال میں اضافہ کی شرح پر غور کریں تو ایران میں یہ اضافہ 1200 فیصد رہا ہے اور سعودی عرب میں 610 فیصد۔ توقع کی جانی چاہیے کہ آئندہ برسوں میں عالم اسلام میں انٹرنیٹ کے استعمال میں اضافہ ہوگا اور مسلم آبادی اس کی مدد سے اپنے نظریات و خیالات دنیا تک پہنچانے کی کوشش کرے گی۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ تہذیبوں کے مابین ٹکراؤ ہو کر رہے گا، ان کے خیال میں اسلام کے اندر، کوئی نیا اتحاد قائم ہوگا جو خطرہ بن کر ابھرے گا۔ لیکن جو لوگ اس نظریہ کے مخالف ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ انٹرنیٹ سے عالمی اثر ونفوذ کی طاقت میں اضافہ ہوگا اور اسلامی مملکتیں اور عوام اس کی مدد سے باقی دنیا کے ساتھ عظیم تر اتحاد و یک جہتی کے قیام کی طرف بڑھیں گے۔ اس ضمن میں آن لائن نیوز فراہم کرنے والے اہم کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ بعض اسلامی ملکوں کے ذریعہ مخصوص آن لائن اداروں تک رسائی کی حوصلہ شکنی کے باوجود عالم اسلام میں انٹرنیٹ کے استعمال میں غیر معمولی اضافہ کے امکانات موجود ہیں۔ انٹرنیٹ کے ذریعہ مفروضوں اور من گھڑت باتوں کی نقاب کشائی کی جا سکتی ہے۔ ''اسلام آن لائن' اور دیگر اسلامی انٹرنیٹ ادارے اسلام کے بارے میں حقائق دنیا تک پہنچا سکتے ہیں۔ انفرادی طور پر بھی اس میڈیم سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے اور لوگوں کو بہت کچھ دیا جا سکتا ہے۔ حکومتیں بھی اپنا رول ادا کر سکتی ہیں اور غیر سرکاری ادارے بھی، بلاگرس بھی اور دوسرے لوگ بھی۔ آج انٹرنیٹ پر اطلاعات و معلومات کی بہتات ہے۔ گوگل سرچ انجن پر جا کر کوئی ایک موضوع ٹائپ کیجئے اور آن واحد میں لاکھوں مضامین آپ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو جائیں گے۔ ہننگٹن کے نظریہ کی مخالفت کرنے والے اور بین المذاہب مذاکرات کی وکالت

کرنے والے مسلم دانشور بھی اس سلسلے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ سائبر اسپیس پر موجود غلط اور گمراہ کن اطلاعات اور معلومات کا جواب بہتر طور پر دیا جا سکتا ہے اور تصادم وٹکراؤ کے نظریہ کی قلعی کھولی جا سکتی ہے۔ کیا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا اور بالخصوص مسلم امہ اس کے لیے تیار ہے؟

بہر حال انٹرنیٹ کے استعمال و عدم استعمال سے قطع نظر ایسے لوگوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جو تہذیبوں کے ٹکراؤ کے نظریہ کے مخالف ہیں۔ ایسے لوگوں کی جانب سے یہ کوشش ہوتی رہی ہے کہ وہ اپنے خیالات میڈیا کے ذریعہ عوام کے سامنے رکھیں۔ اس سلسلے میں میڈیا بھی انتہائی اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ دیانتداری کے ساتھ اپنا فریضہ ادا کرے۔ حالانکہ ابھی تک کا تجربہ یہی بتاتا ہے کہ ٹکراؤ کے نظریہ کو پروان چڑھانے میں میڈیا کا موثر رول رہا ہے۔ اگر میڈیا ٹکراؤ کی بجائے مذاکرات کو فروغ دینے کی کوشش کرے تو یہ امن عالم کیلئے انتہائی مفید اور سود مند ہوگا۔

❀❀❀

ہالی ووڈ کی فلمیں اور مسلمان

اس میں کوئی شک نہیں کہ فلمیں ترسیل وابلاغ کا ایک انتہائی اہم ذریعہ ہیں اوران سے اگر معاشرے میں برائیاں پروان چڑھتی ہیں تو اچھائیوں کی بھی تشہیر کی جاسکتی ہے۔ اگر ہم فحش اور بیہودہ فلموں کو الگ رکھدیں اور سنجیدہ فلموں پر بات کریں تو کہا جاسکتا ہے کہ ایسی فلموں سے ہم ملک اور معاشرے کو مثبت پیغام دے سکتے ہیں۔ آج کے دور میں جو کہ Visual Media کا دور ہے، الیکٹرانک نیوز چینلوں کے ساتھ ساتھ فلموں کو بھی زبردست اہمیت حاصل ہے۔ فلمیں الیکٹرانک میڈیا کا ایک حصہ ہیں اور وہ اپنے دامن میں اچھائیوں اور برائیوں کی تشہیر کے بے پناہ امکانات رکھتی ہیں۔ آج عالمی سطح پر اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں اور گمراہیاں پھیلائی جارہی ہیں ان میں فلموں کا بھی اور بالخصوص ہالی ووڈ کی فلموں کا زبردست رول ہے۔ جس طرح زہر کو زہر سے مارا جاسکتا ہے اسی طرح فلموں کے ذریعہ غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈہ کا منہ توڑ جواب بھی دیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں کوششیں شروع ہوگئی ہیں اور اگر اس طاقتور میڈیم کو اسلام کے حق میں استعمال کیا جائے تو اس کے مثبت نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

ہالی ووڈ کا خودساختہ دشمن:

سرد جنگ کے دوران ہالی ووڈ کی فلموں میں کمیونسٹوں کے خلاف پروپیگنڈہ کیا

جاتا تھااوران کو ویلن کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔مگر سرد جنگ کے خاتمہ اور سوویت روس کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد ہالی ووڈ نے بھی مغرب کی مانند ایک نیا دشمن کھڑا کرلیا ہے یہ مغرب اور ہالی ووڈ کا مشترکہ دشمن ہے اوراس کا نام ''اسلام'' ہے۔ جی ہاں! ہالی ووڈ نے بھی مغربی میڈیا اور مغربی معاشرے کی مانند اسلام کو اپنا دشمن سمجھ رکھا ہے اوراب اس کی فلموں میں اسلام اور مسلمانوں کو ویلن کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اوران کی شبیہہ مسخ کر کے دکھائی جاتی ہے۔آج دہشت گردی جہاں میڈیا اور بالخصوص مغربی میڈیا کا ایک پسندیدہ موضوع بن گئی ہے وہیں یہ موضوع ہالی ووڈ کو بھی بہت مرغوب ہے۔جس طرح مغربی میڈیا میں اسلام کو بیچا جارہا ہے اسی طرح مغربی فلموں میں بھی اسلام کو بیچا جارہا ہے۔اس پروپیگنڈے سے متاثر طبقہ ہراس فلم کو پسند کرتا ہے جس میں اسلام کو ایک خطرناک مذہب اور مسلمانوں کو دہشت گرد بتایا جاتا ہو۔

الرسالہ اور خدا کے لیے:

ہالی ووڈ کی اس خطرناک مہم کا جواب دینا بہت ضروری ہے اوراس کے لیے ان لوگوں کو میدان میں آنا چاہیے جو اسلام مخالف پروپیگنڈے کو غلط سمجھتے ہیں اور جو فلم لائن سے وابستہ ہیں یا جو اس لائن میں جاکر اس گمراہ کن پروپیگنڈہ کو بے نقاب کرسکتے ہیں۔ویسے اس محاذ پر کچھ کام شروع ہوگیا ہے اور حال ہی میں دو فلمیں ایسی آئی ہیں جو اس پروپیگنڈے کا جواب کہی جاسکتی ہیں۔ یہ ہیں مصطفیٰ عقاد کی فلم ''الرسالہ'' اور پاکستانی فلم ''خدا کے لیے''۔ایسا لگتا ہے کہ یہ فلمیں ہالی ووڈ کے گمراہ کن پرچار کا جواب دینے کے لیے بنائی گئی ہیں۔گرچہ یہ ایک بہت ہی چھوٹا قدم ہے لیکن چھوٹے چھوٹے قدموں سے ہی بڑی منزل حاصل کی جاسکتی ہے۔ہالی ووڈ

میں بھی مثبت ذہن رکھنے والے موجود ہیں اور وہ منفی فلموں کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اسی پیمانے پر فلمیں بنائی جائیں جس پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے۔

بعض باتوں سے اختلاف کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ دونوں فلموں میں کسی حد تک اسلام کی سچی اور حقیقی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔آجکل جہاد کو ایک غلط مفہوم پہنا دیا گیا ہے اور قرآن وحدیث میں جس جہاد کی بات کی گئی ہے اس کو عوام کے سامنے پیش کرنے کے بجائے جنگ اور قتل وخوں ریزی ہی کو جہاد بتایا جارہا ہے۔ نام نہاد مسلم تنظیموں نے بھی غلط تصویر پیش کرنے میں جانے انجانے میں تعاون دیا ہے۔وہ لوگ جہاد کا نام لے کر جس طرح بے قصوروں کو نشانہ بنارہے ہیں اسی کو دنیا جہاد سمجھنے لگی ہے۔ الرسالہ میں یہ پیغام بہت واضح انداز میں دیا گیا ہے کہ سب سے بڑا جہاد اپنے نفس کے خلاف جہاد ہے۔جس نے نفس عمارہ کو ماردیا اس نے سب سے بڑا جہاد کیا۔تعلیم کی فرضیت اور جائیداد میں لڑکیوں کی حصہ داری کو بھی اس فلم میں دکھایا گیا ہے۔اس فلم کو دیکھنے کے بعد ایسے بہت سے لوگوں کا تاثر تبدیل ہوسکتا ہے جو اسلام کو ایک خطرناک مذہب اور مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھتے رہے ہیں۔اسی طرح فلم ''خدا کے لیے'' بھی کسی حد تک ایک مثبت پیغام پیش کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ اسلام جنگ وجدال کا نہیں بلکہ صلح وآشتی کا مذہب ہے، اسلام میں کٹر پن نہیں ہے بلکہ وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت اس میں لچک پیدا کر لینے کی صلاحیت بھی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی فلمیں بنانے کا سلسلہ جاری رہے تاکہ ہالی ووڈ اور بالی ووڈ اور میڈیا کے لوگ اسلام کو داغدار کرنے کی جو ناپاک اور خطرناک مہم چلارہے ہیں اسکو پسپا کیا جا سکے۔

منفی تصویر کشی:

ہالی ووڈ کی بلاک بسٹر فلموں سے لیکر بچوں کی کارٹون فلموں تک میں اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے اور اب بھی کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کو وحشی اور ظالم بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور ان کی اسٹیریوٹائپ امیج دکھائی جاتی ہے۔ وہ چاہے فلم Seige ہو یا Last of Ark، یا فلم Aladin ہو یا پھر East is East، ایسی تمام فلموں میں عربوں اور مسلمانوں کو تشدد پسند اور خطرناک اور امن کا دشمن دکھایا گیا ہے۔ ان میں مسلمانوں اور عربوں کو استہزا کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔ اسلامک ہیومن رائٹس کمیشن کے مطابق ہالی ووڈ کی فلموں کو مسلمانوں کو بدنام کرنے کا ایک طاقتور ذریعہ بنالیا گیا ہے۔ ان فلوں کے ذریعہ مسلمانوں کے بارے میں ایک منفی رائے عامہ بنائی جارہی ہے اور ان کو ولین کی حیثیت سے پیش کیا جارہا ہے۔ ان فلموں میں مسلمانوں کے تئیں بے شرمی کی حد تک تعصب کی کار فرمائی ہوتی ہے۔ اس سروے میں جن لوگوں کی رائیں معلوم کی گئیں ان میں سے 62 فیصد نے کہا کہ فلمیں بھی اسلاموفوبیا کی شکار ہیں۔ جبکہ 14 فیصد کے خیال میں یہ فلمیں نسل پرستی میں گرفتار ہیں۔ اسلامک ہیومن رائٹس کمیشن نے سفارش کی ہے کہ سنسر کمیٹیوں کو مزید اختیارات ملنے چاہئیں تاکہ وہ قابل اعتراض مواد والی فلموں کو سرٹیفکٹ نہ دیں یا ان میں سے قابل اعتراض مواد کو حذف کرسکیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک موثر میڈیا واچ ڈاگ قائم ہونا چاہیے جو ان چیزوں پر نظر رکھے اور ضرورت پڑنے پر کارروائی بھی کرے۔ کمیشن کی جانب سے رپورٹ تیار کرنے والی سب کمیٹی کی سربراہ آرزو میرالی کے مطابق ٹیلی ویژن اور فلموں میں مسلمانوں کی نمائندگی خاص طور پر بہت اہم ہے۔ کیونکہ ریسرچ کے مطابق آج دس برطانوی

باشندوں میں سے صرف دو ہی کا قریبی تعلق مسلمانوں سے ہے۔ یعنی دس میں سے آٹھ ایسے ہیں جن کا مسلمانوں سے کوئی رابطہ ہی نہیں ہے اور مسلمانوں کے بارے میں گمراہ کن پروپیگنڈے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

ہر مسلمان برا انسان ہے:

افسوسناک بات یہ ہے کہ ان فلموں میں مسلمانوں کی صرف منفی امیج ہی دکھائی جاتی ہے ان میں کوئی اچھا مسلمان نظر ہی نہیں آئے گا۔ فلم Seige یا محاصرہ نائن الیون سے پہلے بنائی گئی تھی اور اس میں دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں میں تشدد برپا کرنے کے بے پناہ امکانات ہیں۔ اس میں یہ پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان یا عرب امریکا پر حملہ کرتے ہیں اور مردوں عورتوں اور بچوں کا قتل کرتے ہیں۔ دراصل وہ امریکی طرز زندگی پر حملہ کر رہے ہیں۔ اس میں تشدد اور دہشت گردی کے حوالے سے امریکیوں کے خوف پر سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے۔ فلم میں نماز اور اذان کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے اور ان کے پہلو بہ پہلو بم دھماکوں اور انسانوں کے اندھا دھند قتل کے مناظر دکھائے گئے ہیں جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ دہشت گردانہ سرگرمیاں اور اسلامی عقائد و عبادات ایک دوسرے کے لیے جزو لاینفک ہیں۔

امریکا میں عرب امریکیوں اور مسلمانوں نے اس فلم پر شدید نکتہ چینی کی ہے کیونکہ اس میں دنیا کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام دہشت گردی کا مذہب ہے۔ جب یہ فلم سنیما گھروں میں دکھائی جانے لگی تو بعض مسلم تنظیموں کی جانب سے سنیما گھروں کے باہر پمفلٹ وغیرہ کی تقسیم کر کے فلم میں پیش کئے جانے والے مناظر کی مخالفت کی گئی۔ وائس آف امریکا کی نامہ نگار Katayoun

Begeari نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ سرد جنگ کے دوران کمیونسٹوں کو ویلن کی حیثیت سے دکھایا جاتا تھا مگر اب امریکی فلموں میں مشرق وسطیٰ کے دہشت گرد دکھائے جاتے ہیں۔ جن میں بعض کو معصوم شہریوں کو بموں سے اڑانے سے قبل قرآن یا نماز پڑھتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ فلم محاصرہ کے ڈائریکٹر ایڈورڈ زیوک ہیں اور اس میں امریکی اداکاروں کو لیا گیا ہے۔ فلم میں دکھایا گیا ہے کہ امریکی فوجی نیویارک شہر میں دہشت گردوں کی تلاش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ عربوں کو بروکلن کی ایک حوالات میں لے جاکر بند کر دیتے ہیں۔ فلم کے ڈائریکٹر صفائی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ فلم کا پیغام یہ ہے کہ کسی ایک عرب کے اقدامات کا اطلاق تمام عربوں پر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کونسل آن امریکن اسلامک ریلیشنس کے ترجمان ابراہیم ہوپر کے مطابق فلم میں جو پیغام دینے کی کوشش کی گئی اور جس کی طرف ڈائریکٹر نے اشارہ دیا ہے، وہ کہیں کھو گیا ہے۔ اس سے مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت اتفاق کرتی ہے۔ مصری فلم اداکارہ یسریٰ بھی اس فلم کی مخالفت کرتی ہیں وہ کہتی ہیں کہ دہشت گردی صرف عربوں یا مسلمانوں کی جانب سے نہیں ہوتی بلکہ یہ تو پوری دنیا میں موجود ہے۔ مختلف ملکوں اور مختلف مذاہب سے وابستہ لوگ دہشت گردی میں مبتلا ہیں لیکن صرف عربوں یا مسلمانوں کو ہی کیوں دہشت گرد دکھایا جاتا ہے۔ آج یہودی دہشت گردوں پر فلم کیوں نہیں بنائی جاتی۔

اسلام اور دہشت گردی میں چولی دامن کا ساتھ:

اسی طرح فلم ایگزیکٹو ڈیسزن Executive Decision میں فلسطینی دہشت گردوں کے ذریعے جہاز کو اغوا کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ وہاں بھی بے قصوروں کے قتل سے پہلے دہشت گردوں کو قرآن پڑھتے اور نماز ادا کرتے ہوئے

دکھایا گیا ہے۔ اس سے یہ پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام اور دہشت گردی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فلم الہ دین ایک کارٹون فلم ہے اور اس کے شروع میں ایک گیت سنائی دیتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ ایک ایسی سرزمین سے آرہے ہیں جہاں اونٹوں کے قافلے چلتے ہیں اور وہاں اگر کسی کی شکل پسند نہ آئے تو ان کے کان کاٹ لیے جاتے ہیں۔ بعد میں اس مصرعے کو نکال دیا گیا۔ اس کارٹون فلم میں مذہب اسلام اور عرب شناخت کو مثبت اور غیر جانبدارانہ انداز میں دکھانے کے بجائے بربریت پر مبنی اور وحشی سزاؤں والا اور مظالم پسند دکھایا گیا ہے۔

امریکا اور دوسرے ملکوں میں ان فلموں کی مخالفت کرنے والے بھی موجود ہیں ان کا کہنا ہے کہ امریکی فلموں نے اسلام اور مسلمانوں کو منفی تصویر کشی کا موضوع بنالیا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کو انتہا پسندی اور دہشت گردی سے جوڑ کر پیش کیا جانا غلط ہے۔ متعدد لوگوں کا خیال ہے کہ میڈیا مسلمانوں کو خود کو پیش کرنے کے مواقع دینے میں ناکام ہے، ہاں ایسے مسلمانوں کو ضرور جگہ دی جاتی ہے جو یا تو انتہا پسند خیالات کے حامل ہوں یا جو الگ تھلگ پڑے ہوں۔ مذکورہ فلموں کی مانند مزاحیہ فلم ایسٹ از ایسٹ میں ایک اینگلو پاکستانی خاندان کو دکھایا گیا ہے۔ اس میں مسلم شوہر کو کئی شادیاں کرنے والا، بیویوں کو پیٹنے والا اور ان کے ساتھ ناانصافی کرنے والا دکھایا گیا ہے۔ جبکہ ہاوس آف سینڈ اینڈ فاگ (House of Sand and Fog) یعنی ریت اور کہرے کا گھر، میں ایک ایسی عورت کو دکھایا گیا ہے جس کو اس کے شوہر نے گھر سے نکال دیا ہے۔ اس کو ایک ایرانی خاندان اپنا لیتا ہے لیکن اس خاندان کو 1979 کے اسلامی انقلاب کے بعد ملک بدر کر دیا جاتا ہے۔ اس میں ایران کے اسلامی انقلاب کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔

ایک مثبت فلم:

اس طرح ہالی ووڈ کی فلموں میں دولت مند عرب شیوخ، بیلے رقص، برقعہ پوش مسلم خواتین، انتہا پسندی، دہشت گردی، معصوموں کا قتل، وحشت و بربریت اور ایسے ہی بہت سے منفی پہلو دکھائے جاتے ہیں لیکن ایک فلم Kingdom of Heaven جو کہ صلاح الدین ایوبی اور صلیبی جنگوں پر فلمائی گئی ہے، مذکورہ فلموں سے الگ ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ جب مسلم افواج نے یروشلم کو عیسائیوں سے چھین لیا اور اس پر ان کا قبضہ ہوگیا تو ان کے قائد صلاح الدین ایوبی ملبے میں تبدیل ایک کمرے سے گزرتے ہیں اور ان کی نظر ایک صلیب پر پڑتی ہے۔ وہ رک جاتے ہیں اور اسے احترام کے ساتھ اٹھا کر ایک میز پر رکھ دیتے ہیں۔ گویا اس منظر کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان بھی انسان ہیں، ان کے پاس بھی عزت نفس ہے، وہ بھی دوسروں کی عزت کرنا جانتے ہیں، اور عیسائیوں کی مانند ان میں بھی مذہبی عقیدہ موجود ہے۔ (اس میں ایسے کئی مثبت مناظر موجود ہیں۔) فلم کے برطانوی ڈائریکٹر کا کہنا ہے کہ آج بھی مسلمانوں میں یہ تمام خوبیاں ہیں۔ ڈائریکٹر کا کہنا ہے کہ فلم یہ سوال پوچھتی ہے کہ ہم لوگ مل کر ایک ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے۔

ایسا نہیں ہے کہ نائن الیون کے بعد ہی ایسی فلمیں بن رہی ہیں جو مسلم مخالف ہیں بلکہ اس سے پہلے بھی اس قسم کی فلمیں بنتی رہی ہیں اور ان میں مسلمانوں کو جاہل، گنوار، اجڈ، بیویوں کو پیٹنے والے، مشتعل مزاج، قابل نفرت، غیر معتبر، گندے اور بد طینت دکھایا جاتا رہا ہے۔ نائن الیون کے بعد بھی ایسی فلمیں بن رہی ہیں البتہ مسلم تنظیموں نے Kingdom of Heaven کی تعریف کی ہے۔ نائن الیون پر بھی متعدد فلمیں بنی ہیں اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس موضوع پر متعدد ناول بھی لکھے گئے ہیں۔

دی میسیج:

چند سال قبل ایک فلم بنی تھی جس کا نام تھا ''دی میسج'' The Message جسے اردو میں ''پیغام عظیم'' کے نام سے ڈب کیا گیا۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے لیکر فتح مکہ تک کے واقعات کو اختصار کے ساتھ اور انتہائی موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں دو فیصلہ کن جنگوں یعنی جنگ بدر اور جنگ احد کو بھی دکھایا گیا ہے اور اسلام کے ابتدائی ایام میں مسلمانوں پر توڑے جانے والے مظالم کا بھی نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس فلم کے ذریعہ اسلام کے پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور حجۃ الوداع میں آپ کے خطبے کا ترجمہ پیش کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کس طرح صلح و آشتی اور امن و انسانیت کا مذہب ہے، نیز جب مسلمانوں کو مکہ پر فتح حاصل ہوگئی تو کس طرح انھوں نے ان دشمنوں کو معاف کردیا جوان کو تختۂ مشق بنایا کرتے تھے۔ فلم کے آخر میں جب ہندا اپنے شوہر ابوسفیان سے پوچھتی ہے کہ اتنی کثیر تعداد میں لوگ مسلمان ہوگئے اور وہ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہورہے ہیں لیکن کوئی طوفان نہیں آیا (اس کا اشارہ قتل وخوں ریزی اور ظلم و بربریت کی طرف تھا) تو اس پر ابوسفیان کہتے ہیں کہ ''طوفان تو آیا ہے مگر دلوں پر''۔ یہ مختصر سا ڈائلاگ اپنے اندر ایک جہانِ معانی چھپائے ہوئے ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے واقعات فلم میں دکھائے گئے ہیں جو انتہائی متاثر کن اور جذباتی ہیں۔ مسلمانوں کو پاکیزہ اور محترم کردار میں دکھایا گیا ہے جبکہ کفار قریش کو ان کے برعکس پیش کیا گیا ہے۔ اسے پاکستان کے جیو ٹی وی کے اشتراک سے اردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے اور اسے عالمی سطح پر ریلیز کرنے سے قبل لبنان اور ایران

کے علماء کو دکھا کر ان سے فلم کی تاریخی سچائی پر رضامندی حاصل کی گئی تھی۔

ایک اور اہم قدم:

ہالی ووڈ کی فلموں میں مسلمانوں کی منفی تصویرکشی کے اس طوفان میں بعض ایسے سنجیدہ اور انصاف پسند لوگ بھی موجود ہیں جو مسلمانوں کی حقیقی تصویر پیش کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نائن الیون کے بعد امریکی معاشرہ میں مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں جہاں حقائق کی تلاش کرنے والوں کی تعداد بڑھی ہے وہیں منفی سوچ رکھنے والوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اور یہ تاثر پختہ کرنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے کہ اسلام وہی ہے جو گیارہ ستمبر کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ تاہم اسٹیون ڈی مارٹن اور ڈاکٹر میخائیل پنر (Steven D. Mortin. Dr. Mikhail Pinner) نے ایک ایسی دستاویزی فلم بنائی ہے جس میں گیارہ ستمبر کے حملوں کے بارے میں امریکی مسلمانوں کے خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب ورلڈ ٹریڈ ٹاورز زمین بوس ہوا تو نہ صرف غیر مسلم بلکہ مسلمان بھی مبہوت ہو کر رہ گئے تھے اور انھوں نے اس کی شدید مذمت کی تھی۔ یہ ڈاکومنٹری مختلف مسلمانوں کے خیالات پر مبنی ہے۔ فلم میں دکھایا گیا ہے کہ اس حملے سے مسلمانوں کو بھی زبردست دھچکہ لگا تھا۔ ٹولیڈو اوایچ کی باشندہ زینب خان نے کہا کہ جس وقت یہ حملہ ہوا میری سانسیں رک گئی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سانس لینا ہی بند کر دیا تھا۔ میرے گھٹنے کمزور پڑ گئے تھے۔ جبکہ ایک معروف امریکی مسلمان حمزہ یوسف نے کہا کہ مجھے اتنا دھچکہ لگا کہ میں تو فوری طور پر خود کو بیمار محسوس کرنے لگا۔ ڈاکٹر دینا سلیمان نے کہا کہ اس لمحے میں نے جیسا محسوس کیا تھا ویسا زندگی میں کبھی بھی محسوس نہیں کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ

ایک مسلمان کی حیثیت سے یا حجاب پہنے ہوئے میں ایسے سوچ رہی تھی کہ لوگ گھور گھور کر مجھے دیکھ رہے ہیں اور یہ تاثر دے رہے ہیں کہ گویا میں بھی اس کرتوت میں شامل ہوں۔ بعض مسلمانوں نے کہا کہ ہم کو یہ ثابت کرنے کی ضرورت پیش آنے لگی کہ اس حملے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور ہم اس میں ملوث نہیں ہیں۔

اس طرح جہاں نائن الیون پر کئی فلمیں بنی ہیں وہیں اس دستاویزی فلم کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ نائن الیون محض چند لوگوں کی کارستانی ہے، عام مسلمانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کو بھی اس حملے سے اتنی ہی تکلیف پہنچی ہے جتنی کہ دوسروں کو۔ اس کوشش کی بہر حال ستائش کی جانی چاہئے۔

فلموں کا جواب فلموں سے دیں:

ہالی ووڈ فلموں کا یہ ایک بہت مختصر سا جائزہ ہے تاہم اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان فلموں کے ذریعہ کس طرح اسلام اور مسلمانوں کی منفی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ پھر بھی کبھی کبھار کوئی امید افزاء کرن بھی نمودار ہو جاتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے ہالی ووڈ میں تاریکی ہی تاریکی نہیں ہے بلکہ بعض روشن خیال ڈائریکٹرس بھی ہیں جو مسلم مخالف یکطرفہ ماحول میں جرأت سے کام لے کر غیر جانبدارانہ انداز میں کام کرتے ہیں۔ جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا ہے کہ فلموں کے ذریعہ جہاں برائیوں کی تشہیر ہوتی ہے وہیں اچھائیوں کی بھی تشہیر کی جا سکتی ہے، کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مسلمان اس میڈیم میں بھی داخل ہوں اور منفی پروپیگنڈے کا جواب دیں۔ اگر فلم لائن سے وابستہ سنجیدہ فکر کے مسلمان اس جانب توجہ دیں اور فلموں کے ذریعہ گمراہ کن پروپیگنڈے کا جواب فلموں کے ذریعہ دیں تو شاید بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ ڈچ ممبر پارلیمنٹ گیرٹ وائلڈرس

کی متنازعہ اور قرآن مخالف فلم ''فتنہ'' کے جواب میں بھی فلم بنائی جا سکتی ہے۔ جس میں منفی کے بجائے مثبت رویہ اپنا کر اس فلم کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح وائلڈرس نے قرآن شریف کی آیات کو سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کیا ہے، اسی طرح ان آیات اور دیگر آیات کو سیاق وسباق کے ساتھ پیش کر کے مثبت پیغام دیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسی کوئی کوشش کی جاتی ہے تو یہ بھی اسلام کی بڑی خدمت ہوگی۔ اس سلسلے میں ان مسلمانوں پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو فلم لائن سے وابستہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسلام کی تصویر مسخ کرنے کا سلسلہ بند ہو۔ ایسے لوگوں کو آگے آنا چاہئے اور اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لا کر ہالی ووڈ کی اس مہم کا جواب دیا جانا چاہئے۔

❀❀❀

مغرب اور عالم اسلام کا رشتہ

(35مسلم ممالک کے سروے کی روشنی میں)

عام طور پر اسلام اور مغرب کو ایک دوسرے کا حریف یا مخالف سمجھا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی کہ عالم اسلام اور مغرب کے باشندے ایک دوسرے کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں یا تو سنی سنائی باتوں پر یقین کرلیا جاتا ہے یا پھر مفروضے گھڑ لیے جاتے ہیں اور اپنے طور پر ہی یہ فیصلہ کرلیا جاتا ہے کہ ہمارے بارے میں دوسرے کی کیا رائے ہوگی۔ لیکن اس سلسلے میں ایک بین الاقوامی سروے ابھی حال ہی میں مکمل ہوا ہے جس کی روشنی میں مغرب کے بارے میں عالم اسلام کے تصورات وتخیلات کی ایک واضح شکل ابھر کر سامنے آتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر مسلمان مغرب کے بارے میں کوئی منفی رائے رکھتے ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے۔ اس رائے شماری کی روشنی میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مغرب کے خیالات سے بھی آگاہی ہوتی ہے اور مغربی ملکوں کے مسلم باشندوں کی رائیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ سروے 35 مسلم ممالک سمیت چالیس ملکوں اور تین بر اعظموں میں کیا گیا ہے اور اس میں تقریبا ایک ارب لوگوں کی رائیں معلوم کی گئی ہیں۔

یہ سروے واشنگٹن میں قائم رائے شماری سے متعلق ایک بین الاقوامی ادارہ گیلپ انٹرنیشنل Gallop International نے ورلڈ اکانومک فورم کی جانب

سے کیا ہے۔ یہ رائے شماری غالباً دنیا کی سب سے بڑی رائے شماری ہے جو چھ برسوں کی کڑی محنت پر مشتمل ہے۔ 2001 میں اس کا آغاز ہوا تھا اور ابھی حال ہی میں یہ مکمل ہوئی ہے اس کے نتائج اور رپورٹوں کی بنیاد پر ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے:

WHO SPEAKS FOR ISLAM?

WHAT A BILLION MUSLIMS REALY THINK

یعنی مسلمانوں کے لیے کون بولتا ہے اور ایک ارب مسلمان واقعی کیا سوچتے ہیں۔ اس کے مصنف اور مرتب ہیں John Sposito (جان اسپوزیٹو) اور Dalia Mogahed (دالیہ مجاہد) اول الذکر جارج ٹاون یونیورسٹی میں مذہبیات کے پروفیسر ہیں اور ثانی الذکر گیلپ انٹرنیشنل کے مرکز برائے مسلم مطالعات کی ڈائریکٹر ہیں۔

یہ ادارہ رائے شماری سے متعلق دنیا کا سب سے باوقار ادارہ ہے جو گذشتہ 70 برسوں سے اس میدان میں سرگرم ہے۔ اس نے اب تک سینکڑوں موضوعات پر سروے کیا ہے اور حکمرانوں، سیاستدانوں، انتظام کاروں اور دوسروں کو عوامی موڈ اور عوامی رجحان جاننے کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ سائنس مینجمنٹ، معیشت، نفسیات اور سماجیات کے شعبوں سے تعلق رکھنے والے سرکردہ عالمی ماہرین اس سے وابستہ ہیں اور اس کے دو ہزار تجربہ کار اور پیشہ ور کارکن گیلپ یونیورسٹی کے کیمپس اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اس کے چالیس دفاتر سے مختلف تنظیموں کو ویب کے ذریعہ اپنی خدمات فراہم کرتے ہیں۔ گیلپ یونیورسٹی میں مینجمنٹ ایجوکیشن اور لیڈر شپ ڈیولپمنٹ میں ڈگری اور نان ڈگری کے پروگرام فراہم کئے جاتے ہیں۔ گیلپ پریس مینجمنٹ، سماجیات اور سیاسیات پر تحقیقاتی میگزین گیلپ مینجمنٹ جرنل

شائع کرتا ہے۔اسکے علاوہ متعدد موضوعات پر کتابیں بھی شائع کی جاتی ہیں۔

اسلام اور مغرب میں ٹکراؤ کا مفروضہ:

امریکا پر گیارہ ستمبر کے حملے کے بعد امریکی صدر جارج بش نے اپنی ایک تقریر میں مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا تھا کہ ''آخر وہ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں'' (یہ جملہ کتاب میں موجود ہے) انھوں نے اسکی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ ''وہ جمہوری طور پر منتخب حکومت سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ ہماری آزادی، ہماری مذہبی آزادی، ہماری اظہار خیال کی آزادی اور ہماری حق رائے دہی کی آزادی سے نفرت کرتے ہیں۔'' اس تقریر کے بعد گیلپ انٹرنیشنل نے یہ ضرورت محسوس کی کہ اس کا پتہ لگایا جائے کہ کیا واقعی مسلمان امریکا اور دیگر مغربی و یوروپی ملکوں سے نفرت کرتے ہیں اور اگر کرتے ہیں تو اسکی وجہ کیا ہے۔ اور پھر اس نے ایک ہمالیائی پروجیکٹ پر کام شروع کیا اور 35 مسلم ممالک سمیت 40 ملکوں کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے جذبات وخیالات اور احساسات کا سروے کیا۔ جس کے حیرت انگیز نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں۔ رائے شماری پر مشتمل کتاب کے مصنفین کا کہنا ہے کہ اسلام اور مغرب کے درمیان جس ٹکراؤ کا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے وہ ایک بناوٹی اور دکھاوٹی ٹکراؤ ہے اور حقیقت سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ جس ناگزیر ٹکراؤ کی بات کہی جارہی ہے وہ بہت دور ہے۔ سروے میں ایک بنیادی بات یہ ابھر کر سامنے آئی ہے کہ مسلمان مغرب سے نفرت نہیں کرتے بلکہ اسکی آزادی، اسکی جمہوریت، اور اسکی خوبیوں کے معترف ہیں۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مغرب میں اسلام کے تئیں احترام کا جذبہ نہیں ہے اور اگر ہے تو بہت کمزور ہے۔ مغرب کو اسلام کا احترام کرنا چاہیے اور مسلمانوں کو اپنے سے کمتر نہیں بلکہ اپنے برابر سمجھنا چاہیے۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ امریکا اور برطانیہ مخالف جذبات کے باوجود مسلمان ان ملکوں کی متعدد قدروں کے مداح ہیں۔ مسلمان ان کے اصولوں اور ان کے مذہبی خیالات کے مخالف نہیں بلکہ ان کی پالیسیوں کے مخالف ہیں۔ دالیہ مجاہد اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ عالمی سطح پر اسلام کے خلاف ماحول سازی اور پروپیگنڈہ میں میڈیا کا زبردست ہاتھ ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ امریکا کی ٹی وی نیوز کوریج میں عام طور پر اسلام کی ایک منفی تصویر پیش کی جاتی ہے جبکہ اسلامی ٹی وی چینلوں پر عیسائیت پر غیر جانبدارانہ انداز میں مباحثہ ہوتا ہے۔

کون چاہتا ہے بہتر رشتے:

رپورٹ کے مطابق لوگوں کی اکثریت تہذیبوں کے ٹکراؤ کے نظریے میں یقین نہیں رکھتی البتہ ان کا خیال ہے کہ مغرب اور عالم اسلام کا رشتہ آنے والے دنوں میں اور خراب ہوگا۔ تاہم ایک حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ دونوں طرف کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب اور اسلام کے رشتے میں بہتری کی بہت اہمیت ہے۔ مسلم ممالک کی بہت بڑی اکثریت کہتی ہے کہ جہاں عالم اسلام مغرب کے ساتھ بہتر تعلقات کے حق میں ہے وہیں مغرب اس ہدف سے دور ہے۔ جبکہ غیر مسلم ممالک میں اس کے برعکس رائے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مغرب بہتر رشتہ چاہتا ہے مگر مسلمان نہیں۔

عالمی سطح پر اس پر تقریباً اتفاق رائے ہے کہ مسلمان اور مغربی دنیا ایک دوسرے کے تئیں اچھا رویہ نہیں رکھتے۔ امریکا میں ایسا سوچنے والوں کی تعداد 88 فیصد ہے۔ ڈنمارک میں 85، اسرائیل میں 83 اور فلسطین میں بھی 83 فیصد۔ خیال رہے کہ ان پانچوں ممالک میں گذشتہ پانچ برسوں میں فوجی یا ثقافتی ٹکراؤ کا ماحول رہا ہے۔ 75 فیصد مصریوں اور 71 فیصد ترکوں کا بھی یہی خیال ہے۔ تاہم سعودی عرب میں ایسی

مایوسی کا اظہار کرنے والوں کی تعداد 48 فیصد، بنگلہ دیش میں 37 فیصد اور پاکستان میں 26 فیصد ہے۔ ان ملکوں میں عوام کی ایک قابل قدر تعداد کا خیال ہے کہ دونوں فرقوں کے تعلقات خراب ہیں مگر وہ اس کی وجہ بتانے سے قاصر ہیں۔ بنگلہ دیشی مسلمان متعدد امور پر زیادہ پرامید نظر آئے۔ لہٰذا ان کے مثبت رجحان کو ایک عام امید افزا رجحان کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ مسلم ملکوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ مغرب عالم اسلام کے تئیں احترام کا جذبہ نہیں رکھتا تاہم اس مسئلے پر افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کے خیالات مختلف ہیں۔ سب سے زیادہ فلسطینی (84 فیصد) اور اس کے بعد مصری (80 فیصد) ایسا سمجھتے ہیں کہ مغرب مسلم دنیا کو زیادہ عزت نہیں دیتا۔ جبکہ ترکی کے 68 فیصد، سعودی عرب کے 67 اور ایران کے 62 فیصد لوگ ایسا سمجھتے ہیں۔ تمام مسلم اکثریتی ملکوں میں رہنے والی اقلیت کا اکثریتی طبقہ بھی یہی سمجھتا ہے کہ مغرب مسلم دنیا کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ جب مغربی ملکوں کے باشندوں سے سوال کیا گیا کہ کیا مسلم دنیا ان کی عزت کرتی ہے تو سنگاپور کے باشندوں کو چھوڑ کر باقی ملکوں کی عوامی اکثریت نے کہا کہ نہیں مسلم دنیا مغرب کی عزت نہیں کرتی۔ ایسا ہی خیال امریکا کے 82 فیصد اسرائیل کے 73 فیصد، اسپین کے 63 فیصد ڈنمارک کے 69 اور نیدرلینڈ کے 55 فیصد کا ہے۔ سنگاپور کے 41 فیصد لوگوں نے کہا کہ انہیں نہیں معلوم کہ مغرب اور اسلام کے مابین کشیدگی کم ہو رہی ہے۔ جبکہ مصر، ترکی اور فلسطین کی اکثریت نے کہا کہ مغرب اور عالم اسلام کے مابین رابطہ خراب ہوتا جا رہا ہے۔

گیارہ ستمبر کے اثرات:

گیارہ ستمبر کو واشنگٹن اور نیویارک میں دہشت گردانہ حملے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کی مہم میں شدت آ گئی اور ان واقعات کی آڑ میں تمام

مسلمانوں کو نشانہ بنایا جانے لگا۔ حالانکہ دہشت گردی کے واقعات سے مسلمانوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو لوگ اسلام کے نام پر ایسے واقعات کو جائز ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں، مسلمانوں کی اکثریت ان لوگوں کو مسترد کر چکی ہے اور پوری دنیا کے مسلمان کہہ رہے ہیں کہ وہ دہشت گردی کی حمایت نہیں کرتے۔ لیکن اس کے باوجود دہشت گردی کی آڑ میں اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ بنانے کا سلسلہ جاری ہے۔ اس سروے میں گیارہ ستمبر کے حملے کے تعلق سے بھی سوال پوچھا گیا اور مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے اس حملے اور دیگر دہشت پسندانہ حملوں کی سختی سے مذمت کی اور کہا کہ وہ ان حملوں کی حمایت نہیں کرتے۔ دالیہ مجاہد نے واشنگٹن میں ایک نیوز کانفرنس میں اس پر روشنی ڈالی کہ کس طرح گیارہ ستمبر کی آڑ میں اسلام کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ انھوں نے 2004 میں واشنگٹن ٹائمز میں سیموئیل ہیرس کے اس بیان کا حوالہ دیا کہ ''وقت آ گیا ہے کہ ہم اس کا اعتراف کریں کہ ہم دہشت گردی کے خلاف جنگ نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ ہم اسلام کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔'' دالیہ مجاہد نے کہا کہ در اصل سیموئیل ہیرس کہنا چاہتے ہیں کہ انقلاب پسندی اور تشدد کا محرک مذہب ہے۔ ''مذہب مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت کے لیے زندگی کا ایک اہم حصہ ہے اور وہ واقعی انقلابیت اور تشدد کا محرک ہے تو یہ سنگین بات ہے۔''

مسلم اکثریت دہشت پسندی کی مخالف:

لیکن دالیہ مجاہد کہتی ہیں کہ سروے سے یہ ثابت ہوا کہ وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی مذہبیت وسیع پیمانے پر دہشت گردی کی حمایت میں تبدیل نہیں ہوئی ہے۔ یعنی مسلمانوں کی اکثریت دہشت پسندی کی حمایت نہیں کرتی۔ جن لوگوں سے سوال کیا گیا ان میں سے 93 فیصد یعنی دنیا کے ایک ارب تیس کروڑ مسلمانوں کے 93

فیصد لوگ اعتدال پسند ہیں اور محض سات فیصد سیاسی طور پر انقلاب پسند ہیں جسے انگریزی میں Radical کہتے ہیں۔ بیشتر مسلم ملکوں کی بہت بڑی اکثریت نے کہا کہ مذہب ان کی زندگی کا ایک انتہائی اہم حصہ ہے۔ یہ بات کہنے والے انڈونیشیا میں 99 فیصد ہیں۔ مصر میں 98 فیصد اور پاکستان میں 95 فیصد۔ لیکن ایک ارب مسلمانوں میں سے، جن کا سروے کیا گیا ہے، صرف سات فیصد ہی امریکا پر دہشت گردانہ حملے کی حمایت کرتے ہیں۔ اعتدال پسند مسلمانوں نے واشنگٹن اور نیویارک کے حملوں کی مذمت کی کیونکہ ان حملوں میں بے قصوروں اور شہریوں کی ہلاکت ہوئی۔ دالیہ مجاہد کہتی ہیں کہ بہت سے لوگ نائن الیون کے حملوں کی مخالفت کو مذہب کی رو سے جائز ٹھہراتے ہیں۔ وہ قرآن کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ایک بے قصور شخص کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ لیکن جو ریڈیکل یعنی انقلاب پسند مسلمان ہیں وہ ان حملوں کی حمایت مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔ ''سروے سے یہ بھی پتہ چلا کہ جو انقلاب پسند مسلمان ہیں وہ اعتدال پسند مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ مذہبی نہیں ہیں۔ نہ ہی انھوں نے غربت میں اپنی زندگی گزاری ہے اور نہ ہی پناہ گزیں کیمپوں میں۔ اس قسم کے مسلمان زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اور زیادہ باروزگار ہیں۔ وہ مستقبل کے تعلق سے مجموعی مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ پرامید ہیں۔'' ایسا کہنا ہے کتاب کے اول مصنف جان اسپوزیٹو کا۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ مسلمان حقِ خودارادیت چاہتے ہیں لیکن امریکا کا تھوپا ہوا نہیں۔ وہ جمہوریت چاہتے ہیں مگر وہ جمہوریت نہیں جو امریکا چاہتا ہے۔ وہ سیکولرزم بھی نہیں چاہتے اور آمریت بھی نہیں چاہتے۔ وہ ایسی جمہوریت چاہتے ہیں جس میں مذہبی قدریں ہوں۔ دالیہ مجاہد کہتی ہیں کہ اس سروے نے اسلام کی ایک خاموش اکثریت کو زبان دے دی۔ وہ کہتی ہیں کہ ہمیں ان ایک ارب مسلمانوں پر نگاہ ڈالنی چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ

مسلمانوں کی اکثریت کس چیز میں یقین رکھتی ہے۔ ہمیں مسلمانوں کی معمولی سی اقلیت کو ہی سب کچھ نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ سروے سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ امریکا نے جو دہشت گردی مخالف جنگ چھیڑ رکھی ہے اس نے مسلمانوں کے اندر غیر معمولی طور پر امریکا مخالف جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ گیلپ نے امریکا میں بھی ایک سروے کیا ہے جس کے مطابق 39 فیصد امریکی باشندے مسلمانوں سے تعصب رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت شریعت اور اسلامی قوانین کی حمایت کرتی ہے تاہم صرف ایک معمولی سی اقلیت چاہتی ہے کہ مذہبی رہنما قانون سازی کریں۔ بیشتر مسلم ممالک میں خواتین کی اکثریت چاہتی ہے کہ ملکی قوانین شریعت کی روشنی میں بنائے جائیں لیکن اسی کے ساتھ وہ خواتین کے برابری کے حقوق کی بھی سختی سے وکالت کرتی ہیں۔

تبدیلی کے اسباب جاننا ضروری:

گیلپ انٹرنیشنل کے ایک سینئر تجزیہ نگار اور '' مکہ اینڈ مین اسٹریٹ: مسلم لائف ان امریکا آفٹر نائن الیون'' کے مصنف Genieve Abdo کہتے ہیں کہ اعتدال پسند اور انقلاب پسند مسلمانوں میں جو انتہائی مذہبی جذبات ہیں ان کی روشنی میں مغربی حکومتوں کے تئیں مسلمانوں میں زبردست ریز رویشن ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مسلم ملکوں میں جو اسلامی پارٹیاں برسر اقتدار آ رہی ہیں ان کے بارے میں ہمیں جاننا چاہیے اور ان کے برسر اقتدار آنے کے اسباب کا بھی پتہ لگانا چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ برسر اقتدار آنے والی اسلامی پارٹیاں اور تحریکیں بہت مقبول ہیں اور ان کے حامیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ عوام ان پارٹیوں کو اس لیے ووٹ نہیں دیتے کہ وہ ایک پارٹی یا ایک تنظیم ہیں بلکہ وہ مذہب اور طرز زندگی کے حق میں ووٹ دیتے ہیں۔ ان کے مطابق فلسطین میں

حماس کو حاصل ہونے والا ووٹ عرفات کی سابقہ حکومت کے خلاف نہیں تھا بلکہ اس لیے تھا کہ جونئی حکومت بنے وہ مذہبی ہو۔ مسلمانوں کی اکثریت جہاں جمہوریت کے سبب مغرب کی ستائش کرتی ہے وہیں اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب مسلم ملکوں میں جمہوری انداز میں حکومتیں بنتی ہیں تو امریکا ان کے خلاف ہوجاتا ہے۔ وہ اپنی پسند کی جمہوری حکومتیں چاہتا ہے نہ کہ عوامی پسند کی۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ امریکا کو مسلم ملکوں کے معاملات میں مداخلت بند کرنی چاہیے اور مقامی باشندوں کو اپنی پسند کی حکومت چننے کا موقع دینا چاہیے۔ چاہے وہ فلسطین ہو یا ایران یا کوئی اور ملک۔ مصر، اردن اور ایران کے 45 فیصد سے زائد لوگوں کا خیال ہے کہ امریکا اس خطہ میں عوام کو اس کی اجازت نہیں دے گا کہ وہ براہ راست امریکی اثر سے مستثنیٰ اپنا کوئی سیاسی مستقبل طے کریں۔ مغرب کے دوہرے معیار کی بہترین مثال وہ 2006 کے فلسطینی انتخاب کو قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب مزاحمت پسند گروپ حماس برسر اقتدار آیا تو امریکا، یوروپی یونین اور اسرائیل نے اس کا بائیکاٹ شروع کردیا۔

توہمات کے بت پاش پاش:

12 / اپریل 2008 کے خلیج ٹائمز میں اعجاز ذکا، سید لکھتے ہیں: رائے شماری کسی بھی معاملہ پر عوامی موڈ بھانپنے کا سب سے اچھا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ کس مسئلے پر کیا سوچتے اور کیا چاہتے ہیں۔ اس لیے رائے شماری یا اوپینین پول کی بہت اہمیت ہے۔ خاص طور پر انتخابات کے موقع پر رائے شماری کے ذریعہ عوامی رجحان کا پتہ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عوامی سروے یا رائے شماری اگر مسلمانوں کے تعلق سے ہو یا مسلمانوں کا مزاج جاننے کے لیے کی گئی ہو تو اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت جبکہ پوری دنیا میں دہشت گردی کے نام پر

مسلمانوں کونشانہ بنایا جارہا ہے اور وہ بے بس و لاچار ہیں، ایسے میں اس رائے شماری کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ بیشتر مسلم دنشوروں کا یہ خیال ہے، اور اسکوعوامی تائید حاصل ہے کہ مارکسزم کی موت کے بعد مغرب نے اپنے لیے ایک نیا دشمن تلاش کرلیا ہے اور وہ دشمن ہے اسلام۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ اس سروے نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بہت سی توہمات اور مفروضوں کے بت کو پاش پاش کردیا ہے اور مسلم مزاج اور رجحان کا نقشہ عوام کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس سے اسلام اور مغرب کے رشتے کو جانچنے اور ناپنے کا ایک نادر موقع ملتا ہے۔ اس سروے کے بعض نتائج تو بہت چونکانے والے ہیں۔ ایک بات بہت کھل کر سامنے آئی ہے اور جس کا علم مسلمانوں کو پہلے سے ہے مگر وہ بات مغربی عوام کے سامنے کھل کر کبھی رکھی نہیں جاسکی وہ یہ ہے کہ موجودہ دہشت گردی کے پسِ پشت اسلامی تعلیمات نہیں بلکہ مغرب کی تاریخی ناانصافیاں کارفرما ہیں۔ ان ناانصافیوں نے ہی بہت سے مسلمانوں کو مغرب کے خلاف پُرتشدد ردعمل ظاہر کرنے پر مجبور کردیا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ اس رائے شماری کے نتائج کو مغرب تک پہنچایا جائے اور اس کے پیغام سے مغربی عوام کو روشناس کرایا جائے۔

اکثریت مغربی ترقی کی مداح:

مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت خواہ وہ سنی سعودی عرب کی ہو یا شیعہ ایران کی، حیرت انگیز طور پر مغرب، اس کی اقدار اور اس کے اصولوں سے پوری طرح واقف ہے۔ دراصل ان میں سے بیشتر مغرب کی سائنسی ترقیات، سائنسی حصولیابیوں، معاشی ترقیات اور علم کی قدر کے مداح ہیں۔ مسلمان مغرب کی سیاسی

آزادی جمہوریت اورعوام کے حقوق واختیارات کے قدردان ہیں۔

انڈونیشیا دنیا کا سب سے بڑا مسلم ملک ہے اور 94 فیصد انڈونیشیائی باشندوں نے اس سروے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ ایران میں 89 فیصد اور سعودی عرب میں 73 فیصد لوگوں نے مغرب کے بارے میں اپنی رائے دی ہے۔ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت کا کہنا ہے کہ خواتین اپنے گھروں سے باہر جا کر وہ کام کرسکتی ہیں جس کی وہ اہل ہیں (88 فیصد انڈونیشیائی، 72 فیصد مصری اور 78 فیصد سعودی) اور ان کا یہ بھی خیال ہے کہ عورتوں کو بغیر کسی مداخلت کے ووٹ دینے کا حق ملنا چاہیے۔ (87 فیصد انڈونیشیائی، 91 فیصد مصری اور 98 فیصد لبنانی)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ سروے الجزیرہ نے نہیں کیا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بن لادن کا پسندیدہ چینل ہے بلکہ ایک غیر جانبدار بین الاقوامی ایجنسی نے کیا ہے جس کا مرکز واشنگٹن میں ہے۔

بدگمانی کا ذمہ دار مغرب ہے:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی وجہ ہے جو مغرب اور عالم اسلام کو ایک دوسرے سے دور کرتی ہے۔ اس کا جواب مغرب کے رویے میں پوشیدہ ہے۔ Gallop اس کے لیے مغرب کو ذمہ دار گردانتا ہے۔ اس رائے شماری سے یہ بھی پتہ چلا کہ مسلمانوں کی جانب سے جہاں مغربی جمہوریت، آزادی اور اقدار کی ستائش کی گئی وہیں ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب ان اصولوں کو عالم اسلام میں نافذ کرنے کی بات آتی ہے تو ان کو آسانی کے ساتھ الگ تھلگ رکھ دیا جاتا ہے۔

جب Gallop کی جانب سے مسلمانوں سے یہ سوال کیا گیا کہ عالم اسلام سے اپنے تعلقات کو استوار کرنے کے لیے مغرب کو کیا کرنا چاہیے تو بیشتر لوگوں نے

جواب دیا کہ مغرب کو اسلام کا مزید احترام کرنا چاہیے اور مسلمانوں کو اپنے برابر سمجھنا چاہیے نہ کہ کمتر۔ رائے شماری کے مطابق مغرب اور بالخصوص امریکا اسلام کا احترام نہیں کرتا۔ امریکیوں کی اکثریت (66 فیصد) اس کا اعتراف کرتی ہے کہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے تعلق سے تعصبات ہیں۔ پانچ میں سے ایک شخص نے کہا کہ وہ مسلمانوں سے تعصب رکھتا ہے۔ تقریباً نصف امریکیوں کا خیال ہے کہ امریکی مسلمان ملک کے تئیں وفادار نہیں ہیں اور چار میں سے ایک امریکی چاہتا ہے کہ کوئی مسلمان اس کا ہمسایہ نہ ہو۔

ان حقائق کے پیش نظر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ امریکی میڈیا اور ہالی ووڈ مسلمانوں کو دہشت گرد کیوں کہتے ہیں۔ اگر مسلمان ذرا بھی امریکا مخالف جذبات رکھتے ہیں تو اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ امریکی کیسے ہیں بلکہ یہ ہے کہ انھوں نے عالم اسلام میں کیا کیا ہے اور کیا کر رہے ہیں۔ دراصل مغرب اور عالم اسلام میں یہ تقسیم انتہائی افسوسناک اور غیر فطری ہے۔ کیونکہ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو امریکیوں اور مسلمانوں کو متحد کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک اللہ میں ان کا ایمان اور عقیدہ ہے۔ امریکیوں اور مسلمانوں کے روزمرہ کے کاموں میں مذہب کا ایک صحت منداور مثبت رول ہے۔ ان میں ایمانداری، سچائی، کڑی محنت، جواب دہی اور اپنے خاندان کے تئیں وفاداری جیسی آفاقی قدریں ہیں۔ اگر ہم اپنے آس پاس دیکھیں تو پائیں گے کہ ہمارے اندر تفریق کم اور مماثلت زیادہ ہے۔ اس لیے یہ تقسیم و تفریق دراصل ایک المیہ ہے۔ مسلمان اس خلیج کو پر کرنا چاہتے ہیں۔ کیا دوسرا فریق بھی ایسے جذبات واحساسات رکھتا ہے؟

ہندوستانی اور مغربی میڈیا میں

نظریاتی مماثلت

عام طور پر مسلمانوں کی جانب سے یہ الزامات عائد کئے جاتے ہیں کہ ہندوستانی میڈیا مسلم کوریج کے سلسلے میں غیر جانبدار نہیں رہ پاتا اور وہ پوشیدہ تعصب کی کارفرمائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ نظریاتی طور پر مغربی میڈیا کے قریب ہے یا دونوں میں نظریاتی مماثلت ہے۔ بعض لوگوں کے الزامات میں اور شدت آ جاتی ہے اور وہ ہندوستانی میڈیا کو مغربی میڈیا کا دم چھلہ کہنے لگتے ہیں۔ اگر ہم گہرائی میں جا کر جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ الزامات اگر پوری طرح سچ نہیں ہیں تو پوری طرح بے بنیاد بھی نہیں ہیں۔ حالانکہ سارے غیر مسلم صحافی ایسے نہیں ہیں بلکہ ایسے صحافیوں کی خاصی تعداد موجود ہے جو غیر جانبدار اور غیر متعصب رپورٹنگ کے حمایتی ہیں۔ وہ مسلم مخالف رپورٹنگ کے خلاف شمشیر برہنہ بھی بن جاتے ہیں اور کھل کر مسلمانوں کی مظلومیت کا ساتھ دیتے ہیں۔

تاہم اگر ہم مغربی میڈیا اور ہندوستانی میڈیا کو پہلو بہ پہلو رکھ کر جائزہ لیں تو ان میں بہت فرق کے باوجود کافی مماثلت ملے گی۔ جس طرح مغربی میڈیا کا ایک طبقہ مسلمانوں کے تعلق سے گمراہ کن رپورٹنگ کا سہارا لیتا ہے، اسی طرح ہندوستانی میڈیا کا ایک طبقہ بھی حقائق کو توڑ مروڑ کر اور پس منظر و پیش منظر سے الگ کر کے پیش کرتا ہے۔ جب معاملہ دہشت گردی کا ہو تو کیا کہنے۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا

کے رپورٹر خاصے جوش میں آجاتے ہیں اور دہشت گردانہ واقعات کے ڈانڈے مسلم تنظموں اور اسلام سے ملانے لگتے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض میڈیا ادارے مغربی صحافیوں سے بھی دو قدم آگے نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں اور پولیس ذرائع کے حوالے سے ایسی رپورٹنگ کرتے ہیں جیسے مسلمانوں کے خلاف سارے ثبوت ان کے ہاتھوں میں آگئے ہیں۔ پولیس بیانات کی بنیاد پر وہ نہ صرف نتیجہ اخذ کرتے ہیں بلکہ فیصلہ بھی سنا دیتے ہیں۔

ممبئی لوکل ٹرینوں کے دھماکے:

جب ممبئی کی لوکل ٹرینوں میں دھماکے ہوئے تو حکومت نے فوری طور پر پاکستان کی طرف انگشت نمائی کی۔ میڈیا نے ان دھماکوں کے لیے پاکستان کو قصوروار ٹھہرادیا اور ذرائع ابلاغ کے تمام اداروں نے اس کی خوب تشہیر کی۔ حالانکہ پاکستان نے اس کی تردید کی لیکن اس تردید کو زیادہ جگہ نہیں ملی۔ اس واقعہ کے بعد جب وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ نے پارلیمنٹ میں سوالوں کے جواب میں بتایا کہ ممبئی کی لوکل ٹرینوں میں ہوئے دھماکوں میں پاکستان ملوث نہیں ہے تو میڈیا نے اسے شائع یا نشر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اسی طرح جب گیارہ اگست 2006 کو امریکا نے ہندوستان میں اپنے باشندوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ہوشیار رہیں اور اپنی سلامتی کے تئیں فکرمند رہیں تو میڈیا نے اس کو کافی اہمیت دی اور اسے نمایاں انداز میں شائع اور نشر کیا گیا۔ انھوں نے خوب بڑھ چڑھ کر بتایا کہ ممبئی اور دہلی دہشت گردوں کے نشانے پر ہیں اور جب بھی لفظ دہشت گرد کا استعمال ہوتا ہے تو فطری طور پر توجہ مسلمانوں کی طرف چلی جاتی ہے۔ حالانکہ امریکا نے اپنے شہریوں کو صرف انتباہ دیا تھا، اس کے پاس اس کی

کوئی اطلاع نہیں تھی کہ دہشت گرد کہاں کہاں حملے کر سکتے ہیں۔لیکن میڈیا نے ان مقامات کے نام بھی بتا دیے جہاں حملے ہو سکتے تھے۔جبکہ یہاں کے داخلہ سکریٹری نے ایسے کسی بھی ممکنہ حملے سے انکار کر دیا تھا لیکن ان کے بیان کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔اگر مغربی میڈیا یا امریکا کی طرف سے کوئی اعلان آتا ہے تو یہاں کا میڈیا فوراً اپنے انداز میں اس کے معنی و مفاہیم تلاش کر لیتا ہے اور پھر نیوز چینل گھنٹوں اسی خبر کو دہراتے رہتے ہیں۔

وندے ماترم اور مالیگاؤں کے دھماکے:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی میڈیا میں مسلم مخالف تعصبات موجود ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو بدنام کرنے یا ان کی شبیہ خراب کرنے والی رپورٹیں عام طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔چند سال قبل سرکاری اسکولوں میں وندے ماترم گانے کو لازمی قرار دینے کا تنازعہ اٹھا تھا اور اس وقت صحافیوں کے ایک طبقہ نے عام طور پر یہ تاثر پیش کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس کی مخالفت کرنے والے مسلمان محب وطن نہیں ہیں۔اس نے اپنے طور پر مسلمانوں کو غیر محب وطن ہونے کا سرٹی فکٹ دیدیا تھا۔اسی طرح جب مالیگاؤں میں ایک مسجد کے باہر بم دھماکے ہوئے جن میں کم از کم چالیس مسلمانوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا تھا تو اس وقت بھی میڈیا کا تعصب سامنے آیا تھا۔ جہاں اس سے پہلے کے ممبئی ٹرین دھماکوں کی خوب کوریج ہوئی تھی وہیں مالیگاؤں دھماکوں کو زیادہ کوریج نہیں ملی۔اس سلسلے میں بعض غیر جانبدار اور سنجیدہ غیر مسلم دانشوروں کا خیال ہے کہ ممکن ہے کہ اس کی اصل وجہ یہ رہی ہو کہ اس میں تمام تر ہلاکتیں مسلمانوں کی ہوئی تھیں۔میڈیا نے مالیگاؤں بم دھماکوں کے سلسلے میں بھی کسی ہندو انتہا پسند تنظیم کا نام نہیں لیا بلکہ پاکستان کی آئی ایس آئی

اور ''انقلابی مسلمانوں'' پر شبہات ظاہر کئے گئے اور کہا گیا کہ ممکن ہے کہ یہ دھماکے مسلکی جھگڑوں کا نتیجہ ہوں۔ میڈیا نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی جیسے ہندوایسی دہشت گردانہ کاروائیاں کر ہی نہیں سکتے۔ یہ تو صرف مسلمانوں کا ہی کام ہوسکتا ہے۔ مسلم معاملات کے ماہر ایک دانشور یوگیندر سکند کا کہنا ہے کہ حالیہ دہائیوں میں ہندوستان میں سینکڑوں مسلم مخالف فسادات کے باوجود جن میں ہزاروں لوگوں کی جانیں گئی ہیں، میڈیا نے یہی تاثر دیا جیسے ہندوایسے کام نہیں کر سکتے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ممبئی ٹرین دھماکوں کے سلسلے میں پولیس نے متعدد مسلمانوں کو گرفتار کیا اور انہیں اوران کے اہل خانہ کو ہراساں کیا لیکن مالیگاؤں دھماکہ کیس میں مسلم مخالف ہندوتو کارکنوں سے کوئی سوال نہیں کیا گیا۔ ان سے پوچھ تاچھ نہیں کی گئی۔ حالانکہ ممکن ہے کہ ان دھماکوں کے پس پردہ انہی کا ہاتھ ہو۔ مین اسٹریم میڈیا نے بھی اس کا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ اس کے فوراً بعد نیوز چینلوں اوراخبارات کے صفحات سے مالیگاؤں دھماکہ کی خبریں اچانک غائب ہوگئیں اوران کی جگہ 1993 میں ممبئی میں ہوئے سلسلے وار بم دھماکوں میں عدالتی کارروائی نے لے لی۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ان دھماکوں میں مسلمان ملوث رہے ہیں۔

یوگیندر سکند کہتے ہیں کہ غیر مسلم انڈین میڈیا کواس کی ذرا بھی پروا نہیں ہے کہ ان سینکڑوں مسلم خاندانوں کوانصاف ملے جن کے لواحقین کو بابری مسجد انہدام کے بعد بھڑکے ممبئی فسادات میں ہندو گینگسٹروں نے پولیس میں موجود مسلم مخالف عناصر کے ساتھ ساز باز کر کے ہلاک کردیا تھا۔ اوران ہلاکتوں نے ان لوگوں کو اکسایا اور مشتعل کیا تھا جنھوں نے بم دھماکوں کی سازش کی۔ میڈیا کواس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ گجرات فسادات کے ان ہزاروں بے بس مسلم خاندانوں کو انصاف ملے جن کے عزیزوں اوراہل خانہ کا سرکاری سرپرستی میں قتل عام کردیا گیا۔

ایسے اور بھی سینکڑوں واقعات ہیں جن میں مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔ لیکن نہ تو نیوز چینلوں کو ان کی پرواہ ہے نہ ہی پرنٹ میڈیا کو۔

میڈیا اور پولیس کی ساز باز کا نمونہ:

ادھر ایک بار پھر مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے کی کوشش میں بعض صحافی اور پولیس والے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہیں اور جب کوئی مسلمان کہیں کسی معمولی سے جرم میں بھی گرفتار ہوتا ہے تو اسے انتہائی پر اسرار طریقے سے دہشت گرد بتانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اخبارات اور نیوز چینلوں کے رپورٹرس ''باوثوق پولیس ذرائع'' کے حوالے سے گرفتار شدگان کا تعلق لشکر طیبہ، جیش محمد اور القاعدہ سے جوڑ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک چشم کشا رپورٹ میں گوری لنکیش نے پولیس اور میڈیا کی قلعی کھولی ہے۔ ہم اس رپورٹ کی تلخیص اس نقطۂ نظر سے پیش کر رہے ہیں کہ میڈیا اور پولیس کے اس کھیل کو آسانی سے سمجھا جا سکے۔

گوری لنکیش لکھتے ہیں کہ حال ہی میں کرناٹک کے قصبوں ہبلی اور ہونالی سے گاڑی چوری کے الزام میں تین نوجوان گرفتار کئے جاتے ہیں۔ چونکہ اتفاق سے ان کا تعلق مسلم فرقہ سے ہے اس لیے پولیس والے یہ بات چپکے سے لیک کر دیتے ہیں کہ انہیں اندیشہ ہے کہ یہ لوگ ملک میں دہشت گردانہ حملے کی پلاننگ کر رہے ہوں۔ بس پھر کیا تھا، ریاستی میڈیا کے لیے قیاس آرائیوں پر مبنی رپورٹوں کی سیریز چلانے کا ایک نادر موقع ہاتھ آ گیا۔ اخبارات اور نیوز چینلوں میں ان تینوں کو خوفناک دہشت گرد دکھانے کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ تقریباً تمام رپورٹر اپنی تخیلاتی صلاحیت استعمال کر کے رپورٹنگ کرنے لگے کہ معتبر پولیس ذرائع کے مطابق یہ تینوں دہشت گرد ریاست کرناٹک کی انتہائی اہم عمارتوں جیسے کہ ودھان سبھا، آئی

آئی ٹی مرکز انفوسیس اور آئی بی ایم اور ہندو عبادت گاہوں کو بم سے اڑانے کی منصوبہ بندی کررہے تھے۔ ان رپورٹوں میں یہ انکشاف کیا جانے لگا کہ ان تینوں کا براہ راست تعلق اسامہ بن لادن سے ہے اور یہ لشکر طیبہ اور سیمی کے سلیپر سیل کے طور پر کام کررہے تھے۔ ان لوگوں پر یہ بھی الزامات لگائے گئے کہ شبہ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے قریبی جنگلوں میں ہتھیار چلانے کی ٹریننگ لی ہے، پاکستانی جھنڈے لہرائے ہیں، ان کے پاس آرڈی ایکس ہے، انھوں نے پوری ریاست میں مختلف سلیپر سیلوں کو اسلحہ تقسیم کئے ہیں، سینکڑوں نوجوانوں کی دہشت گرد تنظیموں میں بھرتی کی ہے، ان کے پاس اے کے 47 رائفل ہیں اور اسرائیلی ساخت کے ہتھیار ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان الزامات کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں تھا۔

جو اطلاعات پولیس کے حوالے سے دی گئیں وہ دراصل مقامی رپورٹروں کے تخیلات کی پروازیں تھیں اور نیوز چینلوں نے اپنا ٹی آر پی بڑھانے اور اخبارات نے اپنی سیل بڑھانے کے لیے ایسی رپورٹیں شائع کیں۔ بعض رپورٹوں میں کہا گیا کہ پولیس والوں نے اپنا نام نہ چھاپنے کی شرط پر بتایا ہے، لیکن جب چھان بین کی گئی تو یہ باتیں بے بنیاد ثابت ہوئیں۔ ہم ایسی ہی ایک رپورٹ کا جائزہ لیتے ہیں۔

کنٹر روزنامہ ''ادیانی'' کے مینجنگ ایڈیٹر نے جو کہ ہندوتو حامی نظریات رکھتے ہیں، صفحہ اول پر ایک رپورٹ شائع کی ''گذشتہ دسمبر میں ریاض الدین غوث، محمد آصف، محمد ابوبکر اور حفیظ نے ایک خفیہ میٹنگ کی اور کیوبا کی مونٹیسری جیل میں بند قیدیوں کے ساتھ امریکا کے سلوک کی مذمت کی۔ اس میٹنگ میں جو قرارداد منظور کی گئی تھی اس کی نقل تحقیقاتی افسران نے ضبط کرلی ہے۔'' ادیانی ایک سرکردہ اخبار ہے اور اس سے سنیئر صحافی حضرات وابستہ ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس رپورٹ میں کسی نے بھی مونٹیسری اور کیوبا جیل میں فرق کو واضح نہیں کیا، مونٹیسری

لفظ اسکول کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور کیوبا میں واقع گوانتا ناموجیل امریکیوں کی ہے۔ اگراس رپورٹ پرغور کریں تو یہ صفحہ اول کی خبرنہیں تھی اوراگر صفحہ اول پردی بھی گئی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا گوانتا ناموبے میں قیدیوں پرامریکی زیادتی کی مذمت کرنا جرم ہے؟ اور کیا اگر کوئی شخص امریکی زیادتی کی مذمت کرتا ہےتواس پر دہشت گرد ہونے کا شبہ کیا جانا چاہیے۔ کیا ایسے سوالات کی مقامی میڈیا میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اہم ہونا بھی جرم ہے:

روزنامہ ہندو میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس کی تلخیص یہ ہے کہ گرفتار شدگان میں سے ایک نے مجسٹریٹ کے سامنے دعوا کیا کہ پولیس نے اس کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس پر مجسٹریٹ کو شبہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی عام نوجوان نہیں ہے۔ (اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئینی بنیادی حقوق اورانسانی حقوق کی معلومات رکھنے والا عام آدمی نہیں ہوسکتا۔) اس خیال کی بنیاد پر مجسٹریٹ نے پولیس کو ہدایت دی کہ وہ اس سے پوچھ تاچھ کرے۔ اوراس کے بعد ہی اس نوجوان کے دہشت گردانہ روابط کا انکشاف ہوگیا۔

روزنامہ ٹائمز آف انڈیا میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے کہ ''جس جیل میں ریاض الدین غوث اور محمد ابوبکر کو رکھا گیا تھا اس کے وارڈن کو ان کے مشتبہ رویے پر شبہ ہوا۔ اس جیل میں وہ گاڑی چوری کے الزام میں بند تھے۔ دونوں آپس میں بہت ہلکی آواز میں بات کرتے، دن میں پانچ بار نماز پڑھتے، ایک دوسرے سے انگریزی میں گفتگو کرتے اور جب صبح کے وقت ہندوستانی جھنڈا لہرایا جاتا تو وہ اس کا احترام نہیں کرتے تھے۔ جیل وارڈن نے اپنے شبہات اعلیٰ پولیس حکام کے

سامنے ظاہر کیے اور انھوں نے ان کا انٹروگیشن ضروری سمجھا۔ اس کے بعد ان نوجوانوں کے دہشت گردانہ منصوبوں کا پتہ چل گیا۔ ان رپورٹوں سے بعض سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے کہ کیا انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی بات کرنا جرم ہے؟ دھیمی آواز میں بولنا گناہ ہے؟ انگریزی میں گفتگو جرم ہے؟ اور کیا پانچ وقت کی نماز پڑھنا مشتبہ سرگرمی ہے؟

صرف اتنا ہی کافی نہیں بلکہ بیشتر میڈیا رپورٹوں میں بتایا گیا کہ ان تینوں کے پاس سے مذہبی کتابیں اور مٹیریل برآمد ہوا ہے۔ رپورٹوں میں متعدد اسٹوڈنٹس کی گرفتاری بھی دکھائی گئی جبکہ پولیس نے کوئی گرفتاری نہیں کی۔ اور بھی بہت سے الزامات لگائے گئے۔ ان رپورٹوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تینوں کو انتہائی خطرناک اور خونخوار دہشت گرد مان لیا گیا۔ جب ان رپورٹوں کی بھرمار ہونے لگی تو ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل آف پولیس شنکر بدری نے ایک نیوز چینل سے کہا۔ ''اب تک ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے جس سے یہ پتہ چلے کہ یہ تینوں نوجوان دہشت گرد ہیں۔ میڈیا دھواں دھار طریقے سے فرضی خبریں دے رہا ہے۔ کیا ہوگا اگر یہ کیس بھی محمد حنیف کے کیس کی مانند ہو گیا۔ (محمد حنیف کو آسٹریلیا میں دہشت گردانہ کاروائیوں کے شبہے میں گرفتار کیا گیا تھا اور بعد میں ثبوت نہ ہونے کے سبب چھوڑنا پڑا تھا۔) جو دہشت گرد نہیں ہیں ہمیں ان کو دہشت گرد نہیں بنانا چاہیے۔'' لیکن ان کا یہ پیغام میڈیا کے بہرے رپورٹروں نے نہیں سنا اور وہ مسلمانوں کو دہشت گرد بنانے پر اب بھی تلے ہوئے ہیں۔

❀❀❀

میڈیا رپورٹنگ اور مسلم ردعمل

مسلمانوں پر عموماً یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ ردعمل کی ذہنیت کے اسیر ہیں اور جب بھی میڈیا میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے کوئی قابل اعتراض یا ناپسندیدہ چیز آتی ہے تو ان کا ردعمل جارحانہ ہو جاتا ہے۔ اس الزام میں بہت حد تک صداقت ہے۔ ہم بہت دور نہ جائیں اور صرف ماضی قریب کے واقعات پر نظر ڈالیں تو جارحانہ ردعمل کی ایک تاریخ ہمارے سامنے آجائے گی۔ سلمان رشدی کا معاملہ ہو یا تسلیمہ نسرین کا، ڈنمارک کے کارٹونسٹ کی گستاخی کا معاملہ ہو یا ڈچ ممبر پارلیمنٹ کی اہانت آمیز فلم کا، ان تمام معاملات میں مسلمان ردعمل کی انتہاؤں پر پہنچ گئے۔ حالانکہ میڈیا کے ایک حلقے میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے جو قابل اعتراض چیزیں آتی ہیں اس کے کئی اسباب ہیں۔ جن میں دو بہت اہم ہیں۔ ایک منظم سازش اور دوسرے لاعلمی۔ سازش کے تحت بھی مسلمانوں کو مشتعل کیا جاتا ہے اور لاعلمی کی بنا پر بھی۔ بیشتر غیر مسلم صحافی اور رپورٹر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں صحیح معلومات نہیں رکھتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان ان دونوں اسباب کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اسلام مخالف سازش کو ناکام بنانے اور غیر مسلم صحافیوں کو اسلام سے باخبر کرنے کی ذمہ داری مسلم برادری اور بالخصوص تعلیم یافتہ مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن وہ مثبت انداز میں یہ ذمہ داری ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے تو وہ فوری طور پر مشتعل ہو جاتے ہیں اور قابل اعتراض مواد کے مطالعہ کے بغیر ہی سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ شدت پسند انداز میں اس کی مخالفت اور مذمت کرتے ہیں اور علمی و شائستہ انداز میں

جواب دینے کے بجائے اشتعال انگیزی کرنے لگتے ہیں۔ بعض لوگ فوراً قتل کا حکم صادر کردیتے ہیں اور قتل کرنے والے کو انعام واکرام کا لالچ دیکر آگ میں تیل ڈال دیتے ہیں۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا رویہ بھی کوئی بہت مستحسن نہیں ہوتا۔ کچھ پڑھے لکھے لوگ عام احتجاج میں شامل ہوجاتے ہیں اور وہ لوگ جو اس ردعمل کی حمایت نہیں کرتے ایک طرف چپ بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ علمی انداز میں جواب دیتے ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ بعض اوقات عام مسلم ردعمل اس قدر خطرناک ہوجاتا ہے کہ امن وامان کا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے اور پھر اس میں مسلمانوں کا ہی نقصان ہوتا ہے، انہی کی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔

میڈیا کا جواب میڈیا:

دراصل سازش اور لاعلمی کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ مسلمان بھی میڈیا کا جواب میڈیا سے دیں۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ ایک تو مسلمانوں کا اپنا کوئی ایسا طاقتور میڈیا نہیں ہے جو نہلے پر دہلے کا کام کرسکے یا کم ازکم برابری سے جواب دے سکے۔ اور دوسرے یہ کہ مین اسٹریم گلوبل میڈیا میں مسلم نمائندگی بہت کم ہے۔ نائن الیون کے بعد مسلمانوں کی جانب سے کچھ تھوڑی بہت کوشش کی گئی ہے لیکن جس طرح ہندوستان میں اردو اور مسلم میڈیا کا کوئی نوٹس نہیں لیا جاتا اسی طرح عالمی سطح پر بھی مسلم میڈیا کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی جانب سے رسائل وجرائد کی اشاعت ضرور ہورہی ہے لیکن ان کی رسائی صرف ان لوگوں تک ہے جو خود اسلام کے لیے کام کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح ہندوستان میں اردو والے اپنی باتیں اردو اخبارات میں چھاپ کر خود ہی پڑھتے ہیں دوسروں تک وہ اخبارات نہیں پہنچ پاتے، اسی طرح عالمی سطح پر بھی یہ رسائل وجرائد اغیار تک نہیں پہنچ پاتے اور اگر کچھ رسائل پہنچتے بھی ہیں تو وہ زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے۔ یوں تو مسلمانوں کی متعدد ویب سائٹس بھی قائم ہیں اور ان پر اسلام دشمنی کے جوابات

دیے جاتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں وہ بھی زیادہ موثر نہیں ہیں۔ گرچہ ایسی ویب سائٹس کی تعداد ہزاروں میں ہے۔لیکن ان کی آواز بہت نحیف وزار ہے۔

اسلامک چینل برطانیہ کے چیف ایگزیکیٹیو اور مسلم گرین پیجز کے مدیر محمد علی کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کو ایک ایسا میڈیا چاہیے جو ان کی ضرورتیں پوری کر سکے۔ جو اسلامی اقدار پر مبنی مضامین اور رپورٹیں پیش کر سکے اور جو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں بقائے باہم کے اصول کو فروغ دے سکے۔ ان کے بقول باہمی افہام و تفہیم کا رویہ اور ایک دوسرے کے مذاہب وثقافت کا احترام ایک ایسا ماحول پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوگا جس کی آج بہت ضرورت ہے۔ محمد علی کا کہنا ہے کہ ان کے اسلامک چینل کے قیام اور مسلم گرین پیجز کے اجرا کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آج مسلمانوں کو جہاں عالمی میڈیا سے جوڑنے کی ضرورت ہے وہیں ان کی طرف سے گمراہ کن پروپیگنڈے کا جواب دینا اور غلط فہمیوں کو دور کرنا بھی ضروری ہے۔

اس مقصد کے تحت اسلامک چینل کے زیر اہتمام گذشتہ سال مشرقی لندن میں ''گلوبل پیس یونٹی'' کا اہتمام کیا گیا جس میں پچاس ہزار سے زائد مسلم اور غیر مسلم شریک ہوئے۔ اسی طرح ڈینش اخبارات میں حضور اکرم کے اہانت آمیز کارٹونوں کی اشاعت کے بعد ڈنمارک میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس کا عنوان تھا ''اسلامو فوبیا اور مغرب میں گومگو کی صورت حال'' چوبیس گھنٹے چلنے والے اسلامک چینل پر مسلم طرز زندگی کو بھی دکھایا جاتا ہے اور ''پس پردہ'' پروگرام میں خواتین کے پردے کے حوالے سے مثبت باتیں پیش کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ناظرین کے سوالوں کے جواب بھی دیے جاتے ہیں۔ محمد علی کا دعوا ہے کہ یہ چینل اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور نہ صرف برطانیہ بلکہ دیگر مغربی ملکوں میں لوگوں کو یہ احساس ہو رہا ہے کہ مسلمان ایک امن پسند قوم اور دوسرے مذاہب کا احترام کرنے والے لوگ ہیں۔

مسلم کونسل آف برٹین کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر محمد عبدالباری کا بھی خیال ہے کہ گمراہ کن پروپیگنڈے کا جواب دیا جانا ضروری ہے اور غلط فہمیوں کو بھی دور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے مطابق یہ مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے اور دوسروں کے مابین پل بنائیں تا کہ باہمی غلط فہمیاں دور ہو سکیں۔ یہ وقت کا تقاضہ ہے کہ مسلمان اسلام کی بنیادی اقدار پر قائم رہتے ہوئے توہین آمیز تحریروں اور کارٹونوں کا عقلمندی کے ساتھ جواب دیں۔ اس سلسلے میں وہ حضور اکرم کا اسوہ اپنے سامنے رکھیں۔

مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے:

گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد امریکی میڈیا اور مسلمانوں کے رشتے، مزید ابتر ہوئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو بظاہر یہی ہے کہ میڈیا میں مسلمانوں کی موجودگی بہت کم ہے۔ جو غیر مسلم صحافی ہیں وہی مسلمانوں کے معاملات اور مشرق وسطی کے حالات کی کوریج کرتے ہیں۔ بیشتر امریکی مسلمان میڈیا کو اپنا مخالف کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی مسلمان میڈیا کے تعلق سے منفی ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ حالانکہ امریکی اور برطانوی مسلمانوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انہیں معاشرہ اور میڈیا دونوں میں ایک قابل ذکر رول ادا کرنا ہے۔ دراصل میڈیا کے لوگ بھی انسان ہیں۔ ان میں سے بیشتر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بہتر معلومات نہیں رکھتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ بھی سنسنی خیزی میں یقین رکھتے ہیں اس لیے اسلام کے تعلق سے ان کی رپورٹنگ منفی ہو جاتی ہے۔ حقائق تک ان کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ تاہم اگر ان کو حقائق سے روشناس کرایا جائے تو وہ ضرور سنیں گے۔ مسلمانوں کو اس سلسلے میں کوشش کرنی چاہیے۔

امریکا میں مقیم بہت سے مسلم دانشوروں کا خیال ہے کہ مسلمانوں کو میڈیا کا دوست بننا ہوگا اور ذاتی سطح پر اس سے روابط قائم کرنے ہوں گے۔ ان کو اسلام کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کر کے میڈیا کی مدد کرنی ہوگی۔ انہیں اپنے کردار سے

یہ بتانا ہوگا کہ اسلام تشدد کا نہیں بلکہ امن اور پیار محبت کا مذہب ہے اور مسلمان بھی اللہ سے ڈرنے والے، قانون کی پابندی کرنے والے اور اخلاقی اقدار پر چلنے والے لوگ ہیں۔ دراصل میڈیا اور Source یا ذریعہ میں بہت گہرا رشتہ ہے اور اگر مسلمان Source بننے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں تو میڈیا ان کا شکر گزار ہوگا۔ اگر مسلمان اسلام کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کریں تو میڈیا والے ان پر ضرور توجہ دیں گے۔ مثال کے طور پر اگر رمضان کے بارے میں ان کو بتایا جائے تو ممکن ہے کہ وہ اس پر ایسا اداریہ لکھیں جس پر کسی مسلمان کی تحریر کا گمان ہو۔

جو لوگ اطلاعات کی رسائی اور اس کے بہاؤ کو کنٹرول کرتے ہیں دراصل وہی خبر یا اسٹوری کو کنٹرول کرتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ نہ تو روزنامہ اخبارات گہرائی کے ساتھ پڑھتے ہیں نہ ہی رسائل وجرائد، اور جب انہیں کسی اسلام مخالف اسٹوری کا پتہ چلتا ہے تو فوری طور پر ردعمل ظاہر کرنے کے لیے کود پڑتے ہیں۔ نیوز ریسورس پرسن کی حیثیت سے مسلمانوں کو ہمیشہ ایک سچے اور دیانتدار شخص کے طور پر موجود رہنا ہوگا۔ اگر ٹیلی ویژن یا کسی اخبار کی طرف سے کوئی انٹرویو کیا جائے تو یہ بات ذہن میں رہے کہ انٹرویو کو کون کنٹرول کر رہا ہے۔ اگر کوئی پریشان کن سوال آئے تب بھی تحمل کا دامن نہ چھوڑیں، واضح اور جامع جواب دیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب مسلمانوں کے انٹرویو کیے جاتے ہیں تو وہ جذباتی ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ مخالفانہ سوالات اسی لیے پوچھے جاتے ہیں کہ انٹرویو دینے والا اپنا آپا کھو دے۔ لہٰذا مسلمانوں کو ایسے موقع پر صبر سے کام لینا چاہیے۔ کبھی بھی میڈیا کو اپنا دشمن نہ کہیں۔ اس سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوگا۔ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میڈیا ہمارا دشمن ہے تب بھی اس کا اظہار نہ کریں اور اس کی دشمنی کے اسباب تلاش کر کے ان کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو مسلمانوں اور میڈیا کا رشتہ ہمیشہ

ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائے گا اور اس سے مسلمانوں کا ہی نقصان ہوگا۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مسلمان کسی اسٹوری پر مثبت کے بجائے منفی ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ اخبارات کے مدیروں کے نام خطوط بھی تحریر کریں۔ لیکن وہ زیادہ طویل نہ ہوں۔ جامع اور مثبت انداز میں اپنی بات کہی جائے۔ ان پر مکمل پتہ اور فون نمبر بھی درج کئے جائیں۔ تاکہ اگر ایڈیٹر اس سلسلے میں کوئی وضاحت چاہے تو اسے کوئی دشواری نہ ہو۔ خط کا آغاز کالم، خبر یا ایڈیٹوریئل کی تعریف سے کیا جائے اور پھر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا جائے۔ غلط اور مبالغہ آمیز حقائق سے بچا جائے اور صرف اور صحیح حقائق پیش کئے جائیں۔ اگر چند روز میں خط کی اشاعت نہ ہو تو فون پر رابطہ قائم کر کے معلومات حاصل کی جائیں۔

ایڈیٹر کے نام خط کے ساتھ ساتھ پریس ریلیز کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ریلیز بھی جاری کی جائیں اور وہ بھی طویل نہ ہوں۔ ان میں بھی جامع انداز میں حقائق پیش کئے جائیں۔ پریس ریلیز ارسال کرتے وقت ٹائم کی بھی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ نہ تو بہت پہلے ریلیز بھیجی جائیں اور نہ ہی بہت بعد میں تاکہ اخبارات میں انہیں آسانی کے ساتھ جگہ مل سکے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے شہر کے میڈیا کے پتے بھی حاصل کریں۔ خواہ وہ ٹیلی ویژن چینل ہوں یا اخبارات۔ وہ ان سے ذاتی طور پر بھی رابطہ قائم کریں اور تنظیمی سطح پر بھی۔ میڈیا اداروں کے ذمہ داروں اور رپورٹروں کو اپنی کمیونٹی کے پروگراموں میں بلائیں اور اگر انہیں دور سے آنا ہے تو ان کے ٹکٹ بھی ارسال کریں۔ اگر وہ آپ کے تعلق سے کوئی مثبت خبر شائع یا نشر کریں تو ان کا شکریہ ضرور ادا کریں۔ وہ لوگ بھی انسان ہیں۔ انہیں اپنی تعریف سے ضرور خوشی ہوگی اور وہ آئندہ آپ کو یاد رکھیں گے۔ مسلمانوں کو میڈیا کوریج کے رسپانس میں ہمیشہ مثبت اور معاون بنے رہنا ہوگا۔ جبھی کامیابی مل سکتی ہے۔

عالمی اسلامی انٹرنیٹ میڈیا کا جائزہ

اسلام کے خلاف لڑی جارہی جنگ میں جن جدید میڈیائی ہتھیاروں کا استعمال کیا جارہا ہے ان میں ایک ہتھیار انٹرنیٹ بھی ہے۔ آج ہر چیز آن لائن ہوتی جارہی ہے اور لوگ اپنے نظریات وخیالات کو انٹرنیٹ پر ڈال کر آنِ واحد میں پوری دنیا میں پہنچارہے ہیں۔ انٹرنیٹ کسی بھی نظریہ یا خیال کی تشہیر اور پروپیگنڈہ کا ایک طاقتور ذریعہ ہے۔ اسی لیے لوگ اس کی طرف تیزی سے مائل ہورہے ہیں اور نہ صرف یہ کہ وہ انٹرنیٹ پر موجود چیزوں سے باخبر ہورہے ہیں بلکہ اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے بھی انٹرنیٹ کا استعمال کررہے ہیں۔ جس طرح جب بھی کوئی نئی چیز سامنے آتی ہے تو علمائے کرام کا ایک طبقہ اس کے خلاف فتویٰ دے دیتا ہے اور اس کے استعمال کو ناجائز قرار دے دیتا ہے۔ اسی طرح شروع میں انٹرنیٹ کو بھی ناجائز قرار دیا گیا اور اسے اخلاقیات کے لیے خطرناک اور ایک مغربی برائی بتایا گیا۔ لیکن جب انٹرنیٹ کے ذریعہ اسلام کے خلاف جنگ تیز کردی گئی تو علما نے وقت کے تقاضے کے تحت اپنا نظریہ بدلا اور انھوں نے بھی انٹرنیٹ کو ایک ہتھیار کے طور پر اپنالیا۔ یہاں تک کہ جہاں پہلے انٹرنیٹ کے خلاف فتویٰ دیا گیا تھا وہیں اب انٹرنیٹ پر فتوے دیے جارہے ہیں اور اب تو فتویٰ ڈاٹ کام بھی قائم ہوگیا ہے۔ اس وقت ایک اطلاع کے مطابق مسلم دنیا میں سب سے تیزی سے استعمال

اور اختیار کی جانے والی چیز اگر کوئی ہے تو وہ انٹرنیٹ ہے۔ مسلمانوں نے جہاں انٹرنیٹ کے ذریعے جواب دینا شروع کر دیا ہے وہیں انھوں نے اپنی ویب سائٹس بھی بنالی ہیں اور ان سے اسلام کی تبلیغ بھی کی جارہی ہے۔ ایک محتاط تخمینہ کے مطابق اس وقت مسلم ویب سائٹس، فورم، چاٹ رومس، اور بلاگس کی تعداد تقریباً دو لاکھ ہے۔ جو حکومتوں، یونیورسٹیوں، متعدد اداروں، تنظیموں، تحریکوں، مذہبی رہنماؤں اور اشخاص کے ذریعے آپریٹ کیے جارہے ہیں۔ ان میں اللہ ڈاٹ کام، محمد ڈاٹ کام، اسلام ڈاٹ نیٹ، اسلام آن لائن اور اس قسم کی دیگر متعدد سائٹس قابل ذکر ہیں۔

ان ویب سائٹس سے پر امن اور غیر تشدد پسند انداز میں اسلام کی تبلیغ کی جارہی ہے، الزامات کے جواب دیے جارہے ہیں اور لوگوں کے شکوک وشبہات بھی دور کیے جارہے ہیں۔ ان میں عربی اور انگریزی زبانوں کی ویب سائٹس کی تعداد زیادہ ہے۔ انٹرنیٹ کی شاہراہ پر ہر طرح کی سائٹس موجود ہیں بعض سائٹس ایسی بھی ہیں جن سے خلافت کے قیام کی تبلیغ کی جاتی ہے اور بعض سے طاقت کے ذریعہ اسلام نافذ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بعض ویب سائٹس پر عرب اور مسلم حکومتوں کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور بعض سے مغربی اقدار پر یلغار کی جاتی ہے۔ غرض اس وقت مختلف قسم کی ویب سائٹس موجود ہیں جن سے متضاد قسم کے کام لیے جارہے ہیں۔ کچھ سائٹس ایسی ہیں جن سے ان مسلمانوں میں اسلام کی تبلیغ کی جاتی ہے اور اصل اسلام پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو مغربی اقدار سے متاثر ہیں اور جن کے شب وروز میں مغرب بری طرح دخیل ہوگیا ہے۔ ان میں سے کچھ سائٹس ایسی ہیں جو اسرائیل کی زیادتیوں اور فلسطینیوں پر اس کی بربریت کا، مضامین کے ذریعے منہ توڑ جواب دیتی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جو بین المذاہب

مذاکرات اور ڈائلاگ کی حوصلہ افزائی اور وکالت کرتی ہیں۔ ان پر اسلام اور عیسائیت کے مابین مذاکرات پر زور دیا جاتا ہے۔

ویب سائٹس تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے میٹنگ پوائنٹس بھی ثابت ہو رہی ہیں جہاں ہم خیال لوگ ایک دوسرے سے ربط ضبط بڑھاتے اور اپنے خیالات و نظریات سے ایک دوسرے کو باخبر کرتے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں کسی اسلام دشمن کا کوئی مضمون کسی سائٹ پر نظر آیا فوراً اس سائٹ پر اور دیگر سائٹس پر بھی اس کے جواب میں مضامین کے انبار لگا دیے جاتے ہیں۔ پھر ایک بحث شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ مذکورہ اسلام دشمن شخص سے لوگ واقف ہو جاتے ہیں اور اس کو دیے گئے جواب سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔

متعدد اہم اور سرکردہ سنی اور شیعہ رہنماؤں نے بھی اپنی ذاتی ویب سائٹس بنا رکھی ہیں۔ جہاں ان کے پیروکار اور عقیدت مند ان کی تعلیمات کو اپ لوڈ کرتے رہتے ہیں اور اسلامی عقیدہ کی تشہیر بھی کرتے ہیں۔ حزب اللہ کی شیعہ تحریک کے روحانی رہنما شیخ محمد حسین Fadallah کی بھی ایک ویب سائٹ ہے جس کا انگریزی ورژن ہے! english.bayynat.org.lb اس پر ان کے نظریات وخیالات کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ حزب اللہ کے سربراہ حسن نصر اللہ کی بھی ویب سائٹ ہے۔ ایرانی رہنما اور سنی علما بھی اپنی سائٹس قائم کئے ہوئے ہیں۔ ان ویب سائٹس کی ایک اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان پر عالم عرب سے متعلق مواد کی فراوانی ہے۔ عرب اسکالر اور مذہبی رہنما ان کے ذریعہ اپنی باتیں لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ بعض قائدین ان کا سیاسی استعمال بھی کرتے ہیں۔ ان سائٹس پر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ آج مسلمانوں کو کس قسم کی جنگ کا سامنا ہے اور ان کو اس جنگ کا مقابلہ کیسے کرنا ہے۔ بیشتر سائٹس ایسی ہیں جن پر اصل اسلام کا چہرہ پڑھا جا سکتا

ہے۔ بعض پر سیکولرزم، نیشنلزم، سوشلزم اور مغربی دنیا سے درآمد شدہ دیگر نظریات کے خلاف ماحول سازی کی جاتی ہے۔ ان سائٹس پر جہاد کا اصل مفہوم پیش کر کے جہاد کے مغربی تصور کی نفی کی جاتی ہے اور ان دیگر اصطلاحات کا درست مفہوم پیش کیا جاتا ہے، جن کے بارے میں مغرب نے جھوٹی تشہیر کر رکھی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم ویب سائٹ ہے Islamicity.com اس کے ذریعہ غیر سیاسی انداز میں اسلام کو پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کو دعوت کے ذریعہ اسلام کے بارے میں بتایا جاتا ہے اور مذہبی طرز زندگی کے احیاء پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ سائٹ زندگی کے تمام تر شعبوں سے خطاب کرتی ہے۔ اسے نومبر ۱۹۹۸ء میں کیلی فورنیا میں ہیومن اسسٹنس اینڈ ڈیولپمنٹ انٹرنیشنل نے قائم کیا تھا۔ ویب سائٹس کا ایک دوسرا بڑا گروپ اخوان المسلمون کا ہے۔ جس کے ذریعے عرب اور مسلم حکومتوں کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ اس کا نام Ikhwanonline.com ہے۔ اسے مصر میں فروری 2003 میں قائم کیا گیا اور کیلی فورنیا میں رجسٹرڈ کرایا گیا۔ القاعدہ کے لوگ بھی ویب سائٹس کا استعمال کرتے ہیں۔ جو کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تقریباً دو سال قبل القاعدہ کی پروپیگنڈہ مشینری دی گلوبل اسلامک میڈیا فورم نے (GIMF) ''القاعدہ: جہادی تعلیمات کی یونیورسٹی'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا جسے

(www.alquma.net/vb/archvie/index.php/t-179668.html)

پر دیکھا جا سکتا ہے۔ جی آئی ایم ایف متعدد نیوز ایجنسیوں کا ایک گروپ ہے۔ جہاں سے کئی رسالے جیسے الصباح، الفجر، الفرقان وغیرہ شائع ہوتے ہیں اور اس گروپ کے ذریعہ جہادی سائٹس کا استعمال کر کے جہادی ویڈیو اور آڈیو ٹیپس، کتابیں، مضامین، ملٹری ڈکلریشن، نظریاتی دستاویز، ٹریننگ مینول اور جہادی

میگزین وغیرہ پیش کیے جاتے ہیں۔

اس طرح اس وقت عالمی اسلامی ویب سائٹس بھی دیگر سائٹس کے پہلو بہ پہلو انٹرنیٹ شائقین کے مذاق کو آسودہ کرنے اور معلومات حاصل کرنے کی جستجو کی تکمیل کی خاطر ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اگر آپ گوگل سرچ انجن پر جائیں اور اسلامک ویب سائٹس ٹائپ کردیں تو آنِ واحد میں اس سلسلے میں لاکھوں مضامین آپ کے استقبال کو آ کھڑے ہوں گے۔ میں نے جب اسلامک ویب سائٹس ٹائپ کیا تو 0.05 سکنڈ میں تین لاکھ پچاسی ہزار مضامین کی فہرست کھل کر سامنے آ گئی۔ ممکن ہے کہ آپ جس وقت سرچ کریں اس وقت تک اس کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو چکا ہو۔ بہرحال انٹرنیٹ کے ذریعہ جو اسلام مخالف مہم چل رہی ہے اس کا جواب اور مقابلے کے لیے انٹرنیٹ کا استعمال بھی کیا جارہا ہے اور اس سے بہت سے لوگ استفادہ بھی کر رہے ہیں۔

دیگر عالمی ویب سائٹس:

1- allah.com
2- mohammad.com
3- madinagate.net
4- fanawatch.com
5- fatwa.com
6- myqurbani.net
7- discoverislam.net
8- baitulmal.net
9- alagr.com (quraan translation)

10- everythingislamic.com

11- sairhaj.com

12- islamweb.net

13- islamicity.net

14- islamonline.net

15- millat.com

16- irf.net (Islamic research foundation)

17- talkislam.com

18- onlineislamicstore.com

(یہ فہرست کافی طویل ہے)

مسلم وغیر مسلم میڈیا کا عالمی سروے

مسلم اور غیر مسلم ملکوں کا میڈیا اپنے مزاج اور رپورٹنگ کے انداز میں کم و بیش یکساں ہے۔ وہ جب ایک دوسرے کے بارے میں رپورٹنگ کرتے ہیں تو ان کا لہجہ اور انداز بدلا ہوا ہوتا ہے اور وہ اپنے معاملات کو مثبت اور دوسرے کے معاملات کو منفی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلم مغرب معاملات پر جب دونوں رپورٹنگ کرتے ہیں تو ان کا لہجہ غیر جانبدارانہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دونوں میڈیا میں خاص طور پر دیکھا گیا ہے کہ مثبت کوریج کے مقابلے میں منفی کوریج دس گنا زیادہ ہے۔ ایک خاص بات اور نوٹ کی گئی ہے کہ دونوں میڈیا میں مجموعی رپورٹنگ کا پانچواں حصہ مسلم مغرب معاملات پر مشتمل ہے۔ ان کی رپورٹنگ میں ثقافتی اور روایتی معاملات کی کوریج کم منفی ہے۔ تاہم مسلم میڈیا میں مغربی روایات وشناخت کی کوریج کم ہے۔ مشرق وسطی کے تنازعہ کو زیادہ کور کیا جا رہا ہے لیکن مجموعی طور پر اس کا لہجہ منفی ہوتا ہے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے گروپوں کی کوریج کے وقت مسلم میڈیا منفی رنگ اختیار کر لیتا ہے جبکہ غیر مسلم میڈیا بھی مسلم کوریج میں منفی رنگ اپناتا ہے لیکن اس میں شدت ذرا کم ہوتی ہے۔ بیشتر رپورٹوں میں مسلمانوں کو سیاسی یا جنگجویانہ سرگرمیوں میں ملوث دکھایا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس یہودیوں اور عیسائیوں کو مذہبی سرگرمیوں میں

مصروف دکھایا جاتا ہے۔

یہ تجزیہ ہے ''میڈیا ٹینر انٹرنیشنل'' Media Tenor International کے ایک سروے کا جو کہ 24 ممالک میں 2007 میں کیا گیا ہے۔ سروے میں بارہ مسلم اور بارہ غیر مسلم ممالک کو لیا گیا ہے۔ ارو 254092 بیانات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ جن بارہ مسلم ممالک کے میڈیا کا جائزہ لیا گیا ہے وہ ہیں! مصر، انڈونیشیا، ایران، اردن، لبنان، ملیشیا، مراکش، فلسطین، پاکستان، سعودی عرب، ترکی اور متحدہ عرب امارات۔ جبکہ غیر مسلم ممالک ہیں! برازیل، ڈنمارک، فرانس، جرمنی، اسرائیل، اٹلی، نامیبیا، روس، ساوتھ افریقہ، اسپین، برطانیہ اور امریکا۔

میڈیا ٹینر انٹرنیشنل Media Tenor International ایک تجزیاتی و تبصراتی عالمی ادارہ ہے جو سوئٹزرلینڈ کے زیورچ میں واقع ہے۔ وہ 35 ملکوں کے 15 زبانوں کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی رپورٹنگ کا سروے کرتا ہے۔ مذکورہ سروے میں ٹی وی نیوز شو پرنٹ پبلی کیشن اور بزنس پبلی کیشن کے پندرہ ہفتوں کے مواد کا انتخاب کیا گیا۔ اور اس سروے میں 45 ریسرچرس نے اپنی خدمات انجام دیں۔ حال ہی میں اسکی شائع شدہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ 24 ملکوں کے مسلم اور غیر مسلم میڈیا میں شائع اور نشر شدہ بیانات کی بنیاد پر ایشوز کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ بیانات اداروں کے بھی ہیں اور انفرادی بھی ہیں۔ جو ایشوز منتخب کئے گئے ان پر مثبت اور منفی دونوں قسم کے بیانات کا جائزہ لیا گیا۔ جو موضوعات منتخب کئے گئے وہ ہیں! مشرق وسطی تنازعہ سے متعلق بین الاقوامی سیاست، سماجی ارتباط اور سیاست میں مذہب، اخلاقیات اور نظریات کی شمولیت، تعلیمی اور بین ثقافتی سمجھ بالخصوص لوگوں کو دوسروں کے مذاہب اور ثقافت کے بارے میں باخبر کرنے کی کوشش، مذہبی اقلیتوں کا ٹکراو، معاشی و سماجی ترقیات، مسلم۔ مغرب اقتصادی و سماجی تعلقات اور

عراق و ایران تنازعات۔

60 / پرنٹ اور ٹی وی نیوز اداروں میں 290452 بیانات کے تجزیہ سے پتہ چلا کہ مشرق وسطیٰ کے تنازعات کی رپورٹنگ زیادہ ہے۔ حماس کے برسراقتدار آنے کے بعد 2007 میں اس تنازعہ سے متعلق 23.4 فیصد بیانات شائع ہوئے۔ اسرائیل فلسطین تنازع پر 15.3، دہشت گردی پر 21.9، عراق میں جنگ پر 17.6 اور دہشت گردی سے مقابلے سے متعلق اقدامات پر 9 فیصد بیانات دیکھے گئے۔ بین الاقوامی سیاست پر نصف سے زائد رپورٹنگ کا لہجہ غیر جانبدارانہ ہے۔ لیکن چونکہ اس سے متعلق 34.6 فیصد بیانات منفی اور صرف 4.4 فیصد مثبت رہے ہیں، لہٰذا بین الاقوامی سیاست پر رپورٹنگ کا لہجہ مجموعی طور پر منفی ہو گیا ہے۔ تعلیم اور بین ثقافتی سوچ سے متعلق رپورٹنگ مثبت رہی ہے۔

''دوسروں'' کے بارے میں رپورٹنگ کے وقت مسلم اکثریتی ملکوں کے میڈیا کا لہجہ منفی ہو جاتا ہے جبکہ غیر مسلم میڈیا کا لہجہ کم منفی ہوتا ہے۔ مسلم اکثریتی ملکوں کے میڈیا نے 38.2 فیصد منفی بیانات اور 6.4 فیصد مثبت بیانات اور 55.4 فیصد غیر جانبدرانہ بیانات کی رپورٹنگ کی۔ جبکہ غیر مسلم اکثریتی ملکوں کے میڈیا نے 25 فیصد منفی 6.4 فیصد مثبت اور 55.4 فیصد غیر جانبدارانہ بیانات کی رپورٹنگ کی۔

رپورٹ کے مطابق مسلم اکثریتی ملکوں کے میڈیا نے غیر مسلم سرکردہ شخصیات کی کوریج میں خاص طور پر منفی لب ولہجہ اختیار کیا۔ یعنی 40.5 فیصد منفی اور 3.7 فیصد مثبت جبکہ مسلم شخصیات کی کوریج اس طرح رہی: 37.3 فیصد منفی اور 7.6 فیصد مثبت۔ غیر مسلم ملکوں کے میڈیا نے مسلمانوں کے بیانات کی کوریج اس طرح کی: 31.5 فیصد منفی اور 3.1 فیصد مثبت۔ غیر مسلموں کی کوریج اس طرح رہی: 18.9 فیصد منفی اور 4 فیصد مثبت۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں میڈیا نے

ایک دوسرے کی سرکردہ شخصیات کے بیانات کی منفی کوریج زیادہ اور مثبت کوریج کم کی۔ یعنی دونوں کی ذہنیت کم وبیش یکساں ہے۔ دونوں کی سوچ میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔

مسلم اکثریتی اور غیر مسلم اکثریتی ملکوں کے میڈیا کے اس سروے میں ایک اور خاص بات یہ دیکھنے کو ملی کہ اسلام اور مسلمانوں کو زیادہ نمایاں جگہ ملی ہے۔ (مثبت یا منفی سے قطع نظر) یعنی میڈیا میں اسلام اور مسلمانوں کی کوریج، گروپ اور انفرادی دونوں، 56 فیصد رہی۔ جبکہ عیسائیت کو 28 فیصد نمائندگی ملی اور یہودیت کو چار فیصد۔ بقیہ مذاہب میں کسی کو بھی ایک فیصد سے زائد نمائندگی نہیں ملی۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ آج کے بین الاقوامی میڈیا میں اسلام اور مسلمانوں پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ اسکی وجوہات جو بھی ہوں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج پوری دنیا میں سب سے زیادہ موضوع گفتگو اگر کوئی مذہب ہے تو وہ اسلام ہے اور اگر کوئی قوم ہے تو وہ مسلمان ہیں۔

لیکن اس سروے رپورٹ میں یہ نتیجہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ عیسائی اور یہودی اور دوسرے مذاہب کے لوگ مذہبی سرگرمیوں میں زیادہ مصروف رہتے ہیں جبکہ مسلمان سیاسی اور جنگجویانہ سرگرمیوں میں زیادہ ملوث رہتے ہیں۔ عام طور پر صحافیوں کا کہنا ہے کہ (عیسائیوں اور یہودیوں کے بیانات کی روشنی میں) 75 فیصد عیسائی اور یہودی مذہبی امور میں مشغول رہتے ہیں۔ جبکہ مسلم سرکردہ شخصیات کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ مذہبی سرگرمیوں میں صرف 13 فیصد کی شمولیت ہے۔ اور اس کے برعکس جن مسلمانوں کی شناخت ان کے مذہب سے کی گئی ہے، بیانات کی روشنی میں 83 فیصد کی شرکت جنگجویانہ اور سیاسی سرگرمیوں میں ہے۔ رپورٹ کا کہنا ہے کہ مسلمان دیگر مذاہب کے لوگوں کے مقابلے میں بنیاد پرست اور انتہا پسند

سرگرمیوں میں چھ گنا زیادہ سرگرم ہیں۔

جہاں تک تعلیمی اور بین ثقافتی رواداری سے متعلق رپورٹنگ کا تعلق ہے تو غیر مسلم میڈیا میں اس کی رپورٹنگ زیادہ ہے اور مسلم میڈیا میں کم۔ اسی طرح مسلمانوں کی ثقافتی سرگرمیوں پر غیر مسلم میڈیا کی کوریج 6.7 فیصد ہے تو مسلم میڈیا میں عیسائیوں اور یہودیوں کی ثقافتی کوریج 4 فیصد ہے۔ رپورٹ کا کہنا ہے کہ فلسطین، پاکستان، افغانستان، لبنان اور ایران کی سرکردہ شخصیات کے بیانات مسلم میڈیا میں زیادہ شائع ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جن لوگوں کے بیانات شائع ہوئے ہیں ان کی 84 فیصد تعداد سیاسی اور جنگجویانہ سرگرمیوں میں ملوث ہے۔

مسلم-مغرب معاملوں میں سب سے زیادہ کوریج امریکی صدر جارج بش کو ملی ہے۔ غیر مسلم میڈیا میں ان کی کوریج مثبت مسلم میڈیا میں منفی رہی ہے۔ سب سے زیادہ امریکی میڈیا نے ان کی غیر جانبدارانہ کوریج کی اور دوسرے نمبر پر ان کی غیر جانبدارانہ کوریج کرنے والا سعودی عرب کا میڈیا رہا ہے۔ عالمی سیاست میں جارج بش کے بعد سب سے زیادہ کوریج فلسطین اتھارٹی کے صدر محمود عباس کو ملی۔ قابل ذکر ہے کہ روسی میڈیا نے ان کی سب سے زیادہ منفی کوریج کی اور دوسرے نمبر پر ان کی منفی کوریج کرنے والا میڈیا خود فلسطین کا رہا ہے۔ پوپ بنیڈکٹ کو مثبت کوریج حاصل ہوئی اور ایران کے آیت اللہ خامنہ ای اور صدر محمود احمدی نژاد ایرانی میڈیا میں سب سے زیادہ نظر آنے والے رہنما ثابت ہوئے۔ دونوں کو ایران میں 78 فیصد مثبت کوریج ملی۔ جبکہ ایرانی میڈیا نے سب سے زیادہ منفی کوریج برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کو دی۔ اسامہ بن لادن کی حمایت کسی بھی میڈیا نے نہیں کی۔ اسے بیشتر ملکوں کے میڈیا نے سب سے زیادہ منفی کوریج دی۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ سعودی عرب کے میڈیا نے تمام معاملات اور سیاستدانوں پر بیشتر

مثبت رپورٹنگ کی، اس نے منفی رپورٹنگ سے خود کو بچائے رکھا۔

اس طرح اس سروے سے مسلم اکثریتی ممالک اور غیر مسلم اکثریتی ممالک کے میڈیا کے رجحان، لب ولہجہ، انداز اور اس کی سوچ پر سے پردہ اٹھتا ہے اور ایک عمومی صورت حال ہمارے سامنے آتی ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دونوں میڈیا کے صحافیوں پر منفی رجحان حاوی ہے۔ جب اپنے لوگوں کی رپورٹنگ کرتے ہیں تو ان کا انداز دوستانہ ہوتا ہے اور غیروں کی رپورٹنگ کے وقت ان کا انداز معاندانہ اور جارحانہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھی کھل کر سامنے آئی کہ مسلم ملکوں کا میڈیا غیر مسلم ملکوں کے میڈیا کے مقابلے میں زیادہ جذباتی ہے لیکن غیر مسلم میڈیا کو جذباتیت سے عاری ہونے کا سرٹی فیکٹ نہیں دیا جا سکتا۔ صورت حال دونوں جگہ تقریباً یکساں ہے البتہ شدت میں ڈگری کا کچھ فرق ضرور ہو سکتا ہے۔ غیر مسلم ملکوں کے میڈیا نے مسلمانوں کو سیاسی اور جنگجویانہ سرگرمیوں میں زیادہ ملوث ہوتے ہوئے دکھایا ہے جبکہ عیسائیوں اور یہودیوں کی اکثریت کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں مذہبی معاملات میں زیادہ سرگرم رہتے ہیں۔

یہ سروے 16 رجون سے 30 رستمبر 2007 کے مابین کیا گیا۔ اس دوران دس ملکوں کے میڈیا میں شائع بیانات کا یومیہ بنیاد پر تجزیہ کیا گیا جبکہ 14 ملکوں کی 35 دنوں کی رپورٹنگ کو نمونے کے طور پر لیا گیا۔ اس سروے میں کل 160 میڈیا اداروں کا احاطہ کیا گیا۔

امریکا میں اسلام کا خاموش انقلاب

امریکا میں مسلمانوں کی آمد اور اسلام کے تعارف کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ یہ غلاموں کی تجارت سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے افریقی ممالک سے غلام بنا کر مسلمانوں کو امریکا لے جایا گیا تھا اور پھر مسلمان از خود امریکا کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ مورخین نے امریکا میں تارکین کی آمد کو لہر سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہ لہر مختلف ادوار میں اٹھتی اور امریکی ساحل سے ٹکراتی رہی ہے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ اسلام امریکا میں ایک بڑے مذہب کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور اسلام کو سمجھنے اور اسے جاننے کے لیے امریکی باشندے جوق در جوق اسلامی مراکز و مساجد کی طرف رواں دواں ہیں۔

ایک اہم موڑ:

اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہیں ہوگا کہ 11 ر ستمبر 2001 کی تاریخ امریکا میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک اہم موڑ ثابت ہوئی ہے۔ گرچہ گیارہ ستمبر کے حملے کے بعد دوسرے ملکوں سے مسلمانوں کی امریکا میں آمد کچھ متاثر ہوئی تھی لیکن اس کے بعد پھر یہ سلسلہ تیز ہو گیا اور اسلام کے قریب آنے والوں اور اسلام کے دامن میں پناہ ڈھونڈنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت امریکا میں ساٹھ لاکھ سے زائد مسلمان ہیں (وائس آف امریکا کے مطابق

امریکا میں مسلمانوں کی تعداد 70 لاکھ سے زائد ہے۔) اور گیارہ ستمبر کے بعد ہزاروں امریکی مشرف بہ اسلام ہو چکے ہیں۔ تفصیلات کے مطابق 2005 میں 96 ہزار مسلمانوں کو امریکا میں قانونی شہریت حاصل ہوئی۔ گذشتہ دو دہائیوں میں مسلم قانونی شہریوں کی یہ سب سے بڑی تعداد ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق امریکا میں مسلمانوں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے اور 2000 کی ایک ریسرچ کے مطابق اس وقت امریکا میں مسلمانوں کی تعداد یہودیوں کے مساوی تھی۔ امریکا کی خارجہ پالیسی سے اختلاف کے باوجود مسلمان امریکا جارہے ہیں اور اسے اپنا مسکن بنارہے ہیں۔ امریکی وزارت داخلہ مذہب کی بنیاد پر شہریوں کے اعداد وشمار پیش نہیں کرتی۔ تاہم اس نے مسلم ممالک کی جانب سے ہجرت کرنے والوں کے اعداد وشمار فراہم کئے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تارکین میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد کچھ لوگوں کو گرین کارڈ اور کچھ کو نان امیگرینٹ ویزے جاری کئے گئے۔ 2003 تک 22 مسلم ممالک سے آنے والے تارکین کی تعداد میں کافی گراوٹ آگئی تھی۔ اسکی وجہ امریکا کے سخت حفاظتی قوانین ہیں۔ لیکن یہ گراوٹ زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکی۔ 2004 کا آغاز ہوتے ہی نئے تارکین کی تعداد دوگنی ہوگئی۔ مردم شماری بیورو کے فراہم کردہ اعداد وشمار کے تجزیے کے مطابق ترکی، الجیریا، پاکستان، بنگلہ دیش اور دیگر مسلم ملکوں کی جانب سے آنے والے مسلمانوں کی تعداد میں بیس فیصد کا اضافہ ہوگیا۔ 2002 میں جہاں 36 ہزار لوگوں کو نان امیگرینٹ ویزے جاری کئے گئے تھے وہیں گذشتہ سال صرف انڈونیشیا کے 55 ہزار باشندوں کو اس زمرے میں ویزے جاری کئے گئے۔ ہوم لینڈ سیکورٹی کے ایک شعبہ یونائیٹڈ اسٹیٹس سیٹیزن شپ اینڈ امیگریشن سروسز کے ترجمان کرس فیٹلے کے مطابق اس کی وجہ امریکی حفاظتی قوانین میں نرمی نہیں بلکہ

زیادہ سے زیادہ لوگوں کی جانب سے ویزے کی درخواست دینا ہے۔

مسلمان ہر جگہ موجود:

سرکردہ اسلامی یونیورسٹیوں اور اسلامی فاونڈیشنوں نے 2000 میں امریکا میں مسجدوں کے بارے میں ایک سروے کیا تھا۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ امریکا میں مسلمانوں کے نزدیک مساجد کی بہت اہمیت ہے اور اس کا استعمال کثیر مقصدی ہے۔ وہ عبادتگاہیں بھی ہیں اور ثقافتی پروگرام کے مراکز بھی۔ امریکی مسلمان مسجدوں کا استعمال متعدد مقاصد کے لیے کرتے ہیں جس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔ مذکورہ ریسرچ کی رپورٹ کے مطابق اس وقت تک امریکا میں 1209 مسجدیں تھیں۔ جن میں سے تیس فیصد کی تعمیر 90 کی دہائی میں اور 32 فیصد کی تعمیر 80 کی دہائی میں ہوئی تھی۔ 1994 میں امریکا میں مساجد کی مجموعی تعداد 962 تھی۔ 2000 میں اس میں بیس فیصد کا اضافہ ہوا۔ 1994 میں پانچ لاکھ مسلمان مساجد میں نمازوں اور دیگر پروگراموں میں شرکت کرتے تھے۔ 2000 میں یہ تعداد بڑھکر بیس لاکھ ہوگئی۔ اس تعداد میں اضافہ کی ایک وجہ بڑی تعداد میں امریکیوں کا مشرف بہ اسلام ہونا بھی ہے۔ رپورٹ کے مطابق عبادت گزاروں میں تیس فیصد تعداد نومسلموں کی ہے۔ اس رپورٹ کا کہنا ہے کہ سالانہ بیس ہزار امریکی اسلام قبول کر رہے ہیں۔ یہ تحقیق نائن الیون سے قبل کی گئی تھی اور اسکی رپورٹ 2000 میں جاری کی گئی تھی۔ نائن الیون کے بعد ان اعداد وشمار میں کئی گنا کا اضافہ ہوگیا ہے۔ امریکی فوج کی ایک انٹرنیٹ سائٹ www.defenselink.mil پر ایک مضمون پوسٹ کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے ''امریکا میں اسلام کا فروغ''۔ اس میں کہا گیا ہے کہ امریکا میں مسلمان ہر جگہ ہیں۔ وہ آپ کے ڈاکٹر بھی ہوسکتے ہیں اور ٹیکسی ڈرائیور

بھی۔ وہ ریستورانوں میں ویٹر کے روپ میں بھی ملیں گے اور عدالتوں میں قانونی مشورہ دینے والے وکلاء کی شکل میں بھی۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جس طیارے میں آپ جس عہدے پر کام کر رہے ہیں وہ اسی طیارے میں اور اسی عہدے پر بھی مل سکتے ہیں۔ امریکا میں اسلام تیزی سے فروغ پذیر مذہب بن گیا ہے۔'' اسی طرح نیو یارک ٹائمز نے 22 اکتوبر 2001 کو اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ امریکا میں ساٹھ لاکھ سے زائد مسلمان ہیں اور ان کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔ بعض مذہبی رہنما بتاتے ہیں کہ انھوں نے گیارہ ستمبر کے بعد قبول اسلام کرنے والوں کی تعداد میں کئی گنا کا اضافہ دیکھا ہے۔ جبکہ اے بی سی نیوز ڈاٹ کام کے مطابق بعض ماہرین سماجیات کی پیش گوئی ہے کہ امریکا میں پندرہ برسوں میں مسلمانوں کی تعداد یہودیوں سے بڑھ جائے گی۔ ڈیٹروائے نیوز اپنی ایک رپورٹ میں بتاتا ہے کہ امریکا میں صرف مسجدوں کی تعداد ہی میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ ریستورانوں، شاپنگ سینٹروں اور اسپتالوں میں بھی مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ڈیئر بورن اور مشی گن میں مسلمان زیادہ بڑھ رہے ہیں اور مشی گن میں واقع میکڈانلڈز کے ریسٹورینٹ میں اب حلال گوشت بھی ملنے لگا ہے۔ ڈیئر بورن میں اہم سپر مارکیٹس میں بھی حلال گوشت کی دکانیں کھل گئی ہیں۔ Qakwood اسپتال میں مسلم مریضوں کو دیے جانے والے کھانے میں ان کے مذہب کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ماہ رمضان میں ہوٹلوں اور ریستورانوں کے اوقات میں مسلمانوں کے مطابق تبدیلی کر دی جاتی ہے۔ ڈیئر بورن میں بھی مسلمان بڑھ رہے ہیں اور وہ زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ خوشحال ہیں۔ دوسرے بڑے شہروں کا بھی یہی حال ہے۔

قرآن کی مقبولیت میں اضافہ:

گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد امریکا میں قرآن کی تعلیمات پر خاص دھیان دیا جا رہا ہے۔ غیر مسلم امریکی قرآن کے انگریزی ترجمہ کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور ایک رپورٹ کے مطابق امریکا میں قرآن کے نسخوں کی فروخت میں پانچ گنا کا اضافہ ہوا ہے۔ قرآن شریف سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔ قرآن کے انگریزی نسخے چھاپنے والے ایک باوقار پبلشنگ ادارے پینگوئن بکس نے بھی قرآن کی اشاعت میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔ قرآن کی طرف لوگوں کی توجہ میں اضافہ کیوں ہو رہا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ایک ماہر اسلامیات پروفیسر جان اسپوزیٹو کا کہنا ہے کہ قرآن کی طاقت یہ ہے کہ مسلمان یا کوئی بھی شخص قرآن کھول کر کسی بھی صفحہ پر نظر دوڑائے تو اسے وہاں زندگی گزارنے سے متعلق کوئی نہ کوئی پیغام ضرور مل جائے گا۔ امریکی مرکز برائے قانون وانصاف کی پندرہ جنوری 2002 کو جاری ایک پریس ریلیز کے مطابق قرآن کی فروخت میں اضافہ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعض پبلک اسکولوں میں اسٹوڈنٹس سے کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن کی کچھ آیات بھی ازبر کریں۔ مثال کے طور پر بیئرن کیلی فورنیا کے ایک پبلک اسکول میں ساتویں کلاس کے طلبا کو اسلام اور قرآن کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی غرض سے تین ہفتے کا ایک خصوصی کورس چلایا گیا۔ اس دوران اسٹوڈنٹس سے کہا گیا کہ وہ قرآن کی بعض آیات یاد کریں اور اسلامی تاریخ اور پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے بارے میں علم حاصل کریں۔ طلبا کو یہ ہدایت بھی دی گئی کہ انھوں نے جو کچھ سیکھا ہے اس پر لیکچر دیں اور یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ مسلمان کیسے نماز پڑھتے ہیں اور اسلام میں مذہبی فرائض کیا ہیں

اس کا علم حاصل کریں۔ بنگلور ڈیلی نیوز اور دی گارجیئن نے بھی اپنی رپورٹوں میں ایسے ہی انکشافات کئے ہیں۔ ایک معروف امریکی ماہر معاشیات Jeremy Rifkin نے گارجیئن میں اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ انہیں ندامت ہے کہ انھوں نے گیارہ ستمبر سے پہلے اسلام کا مطالعہ کیوں نہیں کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اسرائیل اور عربوں کے مابین تاریخی لڑائی کے بارے میں ان کا علم سطحی اور سرسری تھا۔ ان کے مطابق گیارہ ستمبر کے بعد اسلام کو جاننے کی خواہش رکھنے والے وہ تنہا شخص نہیں ہیں بلکہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ امریکا میں اسلام کے تعلق سے کتابوں کی اشاعت بھی بڑھی ہے۔ وہ جذباتی انداز میں کہتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے گیارہ ستمبر کے بعد پوری دنیا ایک کلاس روم میں تبدیل ہوگئی ہے اور لوگ گیارہ ستمبر کے دردناک واقعہ کے اسباب اور اس کے بعد کے حالات کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام تحقیق کا موضوع بن گیا:

گیارہ ستمبر کے دہشت گردانہ حملوں کو اسلام سے جوڑا جارہا ہے اور مغربی میڈیا اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے، لیکن جب لوگوں نے اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کیا تو ان کو اندازہ ہوا کہ اسلام تشدد اور دہشت گردی کا نہیں بلکہ امن وشانتی، رواداری، عدل وانصاف، انسانیت اور پیار محبت کا مذہب ہے۔ آج اسلام پوری دنیا میں تحقیق کا موضوع بن گیا ہے۔ ریسرچ کی جارہی ہے اور اسلامی اصول ونظریات پر مباحثے ہورہے ہیں۔ ہارورڈ میڈیکل فیکلٹی سے وابستہ ڈاکٹر شیخ ولید اے فطیحی کا ایک مضمون مصری ہفت روزہ الاہرام العربی کے 20 /اکتوبر 2001 کے شمارے میں شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے کہا

ہے کہ جب انھوں نے پہلی بار ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگن پر دہشت گردانہ حملوں کی خبر سنی تو ان کو اندیشہ لاحق ہوگیا کہ انھوں نے امریکا میں اب تک اسلام کی تبلیغ کے لیے جو کام کیا تھا وہ پچاس سال پیچھے چلا گیا ہے۔ لیکن ان کا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا اور اس واقعہ کے بعد انہیں مختلف مقامات پر اسلام پر لیکچر دینے کے لیے بلایا جانے لگا اور اس سلسلے میں ان کی سرگرمیاں بہت زیادہ بڑھ گئیں۔

26 ستمبر 2001 کو لاس اینجلس ٹائمز میں ایک مضمون شائع ہوا جس کے مطابق بہت سے امریکی اسلام کے بارے میں تحقیقات کرنے لگے ہیں۔ یونیورسٹیوں کے کلاسوں میں مشرق وسطی اور اسلام پر جب لیکچر ہوتا ہے تو ہال کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ مشرق وسطی کے اسکالروں اور دانشوروں کو ٹی وی شوز میں مدعو کیا جانے لگا ہے اور جب وہ سڑکوں سے گزرتے ہیں تو ان کو مقبول شخصیات کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اسلامک سینٹر آف سدرن کیلی فورنیا کے مذہبی ڈائریکٹر محمود عبدالباسط کہتے ہیں کہ بے شمار لوگ اسلام کے بارے میں سوالات کی بوچھار کر رہے ہیں جس سے ہم لوگوں کو کافی حوصلہ ملا ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد لاس اینجلس کے اسلامی مرکز میں اسلام کے بارے میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں گورنر، شیرف، میئر اور دیگر سیاسی وسماجی شخصیات کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اسلامی سینٹروں کے عہدیداروں کے مطابق گیارہ ستمبر کے بھرپور اثرات مرتب ہوئے ہیں اور اسلام کا مثبت رخ لوگوں کے سامنے آیا ہے۔

قرآن کے حوالوں کی بھرمار:

آج امریکا میں معاشرتی صورتحال یہ ہے کہ سرکردہ شخصیات اپنی تقریروں میں قرآن کے حوالے دے رہی ہیں، لوگ مساجد میں جاتے ہیں اور اسلام کے

بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاریخ میں پہلی بار پوپ نے عیسائیوں اور مسلمانوں کو مدعو کیا۔ عیسائی مذہبی شخصیات بھی اپنی تقریروں میں قرآن کے حوالے دے رہی ہیں۔ عالمی سطح پر ٹی وی چینلوں پر اسلام کے بارے میں مباحثے ہورہے ہیں۔ سرکردہ عالمی اخبارات ورسائل اسلام اور قرآن پر زیادہ سے زیادہ مضامین شائع کررہے ہیں۔ لائبریریوں میں سب سے زیادہ مقبول وہ کتابیں ہیں جن میں اسلام اور قرآن پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ قابل ذکر سچائی یہ بھی ہے کہ گذشتہ بیس برسوں سے پوری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ 1973 کے اعداد وشمار کے مطابق اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی تعداد پانچ سوملین تھی آج وہ ڈیڑھ ارب ہوگئے ہیں اور Rise of Islam.com کے مطابق آج دنیا کا ہر چوتھا شخص مسلمان ہے۔ اگر مسلم آبادی میں اسی طرح اضافہ ہوتا رہا تو ممکن ہے کہ اسلام ایک روز دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن جائے۔ اس کی وجہ صرف مسلم ملکوں کی آبادی میں اضافہ نہیں ہے بلکہ گیارہ ستمبر کے بعد خصوصی طور پر مشرف بہ اسلام ہونے والوں کی تعداد میں مثالی اضافہ بھی ہے۔

کچھ منفی اثرات:

لیکن ایک طرف جہاں گیارہ ستمبر کے نتیجے میں اسلام کو جاننے کی خواہش میں اضافہ ہوا ہے اور اس کے بھرپور مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں وہیں کچھ منفی اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد بہت سے لوگ مسلمانوں کو شکوک وشبہات کی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں اور کہیں بھی دہشت گردانہ واقعات ہوں ان کو نشانہ ضرور بنایا جاتا ہے۔ امریکا میں مسلمانوں کے داخل ہونے کے تعلق سے زیادہ سختی ہونے لگی ہے اور ان کو مشکوک سمجھا جانے لگا ہے۔ گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد کے

دنوں میں متعدد مساجد پر حملے ہوئے اور مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز جرائم میں اضافہ ہوا ہے۔ ہزاروں مسلمانوں کو ان کے ملک واپس بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ حجاب اور اسکارف والی مسلم خواتین ہدف تنقید و ملامت بننے لگی ہیں۔ بعض مسلم خواتین کو اسکارف نہ پہننے کی ہدایت دی گئی ہے۔ ہوائی اڈوں پر مسلمانوں کو کاغذات کی جانچ پڑتال میں زیادہ وقت دینا پڑتا ہے، اور ان سے بہت سارے سوالات کئے جاتے ہیں۔ نئے تارکین کو تو پریشانیوں کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے بعض اوقات کافی دنوں سے رہ رہے لوگوں کو بھی تنگ کیا جاتا ہے۔ بنگلہ دیش کے 42 سالہ خواجہ میزان حسن تیس سال قبل امریکا گئے تھے۔ وہ جمائکا مسلم سینٹر اور کوئنس کی ایک مسجد کے چیئر مین رہے ہیں وہ ڈیپارٹمنٹ آف پروبیشن نیویارک میں ایک بہت اچھے عہدے پر فائز ہیں، لیکن گیارہ ستمبر کے بعد ان کو کینیڈی ایئر پورٹ پر روک لیا گیا تھا۔ اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کا نام ایک ایسے شخص کے نام سے ملتا جلتا ہے جو واچ لسٹ میں شامل ہے اور جس پر امریکی حکام کی نظر ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد جب حکام نے مسلمانوں سے ایک رجسٹر میں اپنے نام لکھوانے کو کہا تو سینکڑوں پاکستانی تارکین وطن روپوش ہو گئے۔ کوئنس آئی لینڈ ایونیو میں جسے چھوٹا پاکستان سمجھا جاتا ہے، مسلمانوں کی تیس دکانیں بند ہو گئیں۔ 3-2002 کے تعلیمی سال میں ایک مقامی ایلیمنٹری پبلک اسکول 217 میں اردو بولنے والے اسٹوڈنٹس کی تعداد گھٹ کر نصف رہ گئی۔ اسکی وجہ یہ اندیشہ تھا کہ گیارہ ستمبر کے واقعات کے نتیجے میں امریکی حکام مسلمانوں پر سختی کریں گے اور دہشت گردوں کی تلاش اور جانچ پڑتال کے نام پر ان کے ساتھ زیادتی کی جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے مسلمانوں کا کہنا ہے کہ وہ امریکا اس لیے گئے تاکہ وہ اپنا مستقبل سنوار سکیں اور امریکا میں ان کی آمد ان کے لیے نئی زندگی کے مترادف ہے۔

یہ بھی ایک سچائی ہے کہ اسلام کے تیئں منفی سوچ رکھنے والوں کی تعداد 2001 کے مقابلے میں آج کہیں زیادہ ہے۔ واشنگٹن پوسٹ کے ایک اسٹاف رپورٹر نے 9/مارچ 2006 کو اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ایک سروے کے مطابق 46 فیصد امریکی یعنی تقریباً نصف آبادی اسلام کے تعلق سے منفی سوچ کی حامل ہے۔ اسکی وجہ اخبارات اور ٹیلی ویزن پر انتہا پسند مسلمانوں کی کارستانیوں کی رپورٹیں ہیں۔ لوگ دہشت گردی کے واقعات اوران میں مسلمانوں کی شرکت سے یہ نتیجہ نکال رہے ہیں کہ تمام مسلمان ایسے ہی ہیں۔ رائے شماری کے مطابق جنوری 2002 میں اسلام کوتشدد کا معاون سمجھنے والے امریکیوں کی تعداد 14 فیصد تھی جواب بڑھ کر 33 فیصد ہوگئی ہے۔ تین میں سے ایک امریکی مسلمانوں سے تعصب رکھتا ہے۔ 43 فیصد لوگ عربوں کے بارے میں غیرمثبت سوچ رکھتے ہیں۔

ذاتی تاثرات:

دراصل منفی اور مثبت دونوں قسم کی سوچ رکھنے والے موجود ہیں۔ شکاگو کے ایک 65 سالہ اسکول بس ڈرائیور گیری میک کورڈ کے مطابق وہ عربوں کے بچوں کو اسکول لے جاتا ہے۔ اب تک جن بہت اچھے لوگوں سے اس کا واسطہ پڑا ہے ان میں بعض مسلم خاندان بھی ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اس وقت فلسطینی بچوں کو لے جاتا ہے اور وہ لوگ انتہائی شاندار ہیں۔ لیکن اسلام کے بارے میں اس کے خیالات اچھے نہیں ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ میں نے مسلمانوں سے کوئی سخت بات نہیں سنی ہے لیکن وہ لوگ قرآن کے مطابق جن باتوں پر عمل کرتے ہیں ان کو میں پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ وہ نفرت کی تعلیم دیتے ہیں۔ ڈنیش کارٹونوں پر مسلم احتجاج پر اس کا کہنا ہے کہ عرب مذہب کے بارے میں بہت زیادہ

حساس ہیں اور کارٹونوں کے معاملے کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہ رائے شماری اے بی سی نیوز نے کی ہے۔

اس تجزیہ اور تفصیل کی روشنی میں دونوں قسم کی باتیں سامنے آتی ہیں۔ مثبت بھی اور منفی بھی۔ حوصلہ افزا بھی اور حوصلہ شکن بھی۔ لیکن حوصلہ افزا حالات حوصلہ شکن حالات پر بھاری ہیں اور اسلام کے تئیں بدگمانی رکھنے والوں کی تعداد اسلام کو جاننے کا جذبہ رکھنے والوں کی تعداد سے کہیں کم ہے۔ میڈیا جس شدت سے تشدد اور دہشت گردی کو اسلام سے جوڑنے کی مہم چلا رہا ہے، اسی شدت سے لوگ اسلام کے تئیں اپنے مثبت جذبات کا اظہار بھی کر رہے ہیں۔ میڈیا کی رپورٹوں میں اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش ایک طرف اور اسلام کے بارے میں حقائق اور سچائی جاننے کا تجسس دوسری طرف۔ گیارہ ستمبر کے دہشت گردانہ حملوں کی مذمت دنیا بھر کے مسلمانوں نے انتہائی شدت سے کی تھی اور امریکی مسلمانوں نے بھی ان واقعات کی بھرپور مذمت کی تھی۔ آج میڈیا میں وہی رپورٹیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں جن میں اسلام کا حوالہ ہو۔ حوالہ مثبت ہو یا منفی، اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ بلکہ منفی حوالہ اسلام کی مقبولیت میں زیادہ معاون و مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ اس طرح امریکی باشندوں کی اکثریت اسلام کی طرف مائل ہو رہی ہے اور قبول اسلام کرنے والے امریکیوں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے۔ صورتحال کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ رجحان ابھی اور مضبوط ہوگا اور بڑی تعداد میں لوگ مشرف بہ اسلام ہوں گے۔

امریکا میں اسلام کی آمد

اگر ہم امریکا میں مسلمانوں کی آمد کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو پتہ چلے گا کہ

امریکا کی سرزمین پر مسلمانوں کے قدم سترہویں صدی میں پڑے تھے اور مسلم آمد کی تاریخ 1619 میں ورجینیا کے ساحل پر غلاموں کی پہلی کشتی کی آمد سے شروع ہوتی ہے۔ جس میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تعداد معتد بہ تھی۔

اس کے بعد امریکا میں مسلمانوں کو دو گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا چیپل ہل کے نیشنل ہیومنٹیز سے وابستہ ڈاکٹر تھومس اے ٹویڈ Thomas A.Tweed کے مطابق ایک گروپ وہ ہے جو دوسرے ملکوں سے تارکین کی حیثیت سے امریکا آیا اور دوسرا وہ ہے جو بیسویں صدی میں افریقی امریکی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ امریکا جانے والے افریقی غلاموں میں دس فیصد مسلمان تھے۔ بقول ڈاکٹر تھومس کے ان میں اہم نام عمر ابن سعید کا ہے جو کہ مغربی افریقہ کی مسلم ریاست فوٹا ٹورو (Futa Toro) کے ایک دولت مند گھرانہ میں پیدا ہوئے تھے۔

تھومس کے بقول وہ ایک مذہبی اسکالر اور تاجر تھے لیکن مورخوں نے بوجوہ ان پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ 1807ء میں ڈیڑھ ماہ تک بحری سفر میں گزارنے کے بعد ساوتھ کیرولینا کے چارلسٹن پہنچے تھے۔ وہ غلام بنا کر وہاں لے جائے گئے تھے۔ چارلسٹن میں ان پر ان کے آقا نے اتنا ظلم ڈھایا کہ وہ جان بچا کر فرار ہو گئے لیکن نارتھ کیرولینا میں گرفتار کر لیے گئے اور ایک مقامی رئیس کے ہاتھوں بیچ دیے گئے۔ تارکین کے قافلے 1875 سے 1912 کے درمیان موجودہ شام، لبنان، اردن، فلسطین اور اسرائیل کے دیہی علاقوں سے امریکا پہنچے جن میں عیسائی اور مسلمان دونوں تھے۔ پھر 1947 سے 1960 کے درمیان مسلم قافلے امریکا میں اترتے رہے۔ جن میں ہندوپاک کے کچھ لوگ بھی شامل تھے۔

لیکن امریکا میں مسلم تعداد میں اضافہ انیسویں صدی میں ہوا تھا جب ہزاروں

عربوں نے تارکین کی حیثیت سے سرزمین امریکا پر قدم رکھا۔ وہ پہلے کرایے کے مکانوں میں عبادت کیا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے 1935 میں IOWA میں ایک مسجد تعمیر کی۔ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نارتھ ڈکوتا اور ڈیٹرائے، پیٹس برگ اور مشی گن سٹی انڈیانہ میں بھی مسلمانوں نے مساجد تعمیر کیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ اسلام امریکا کے قلب میں داخل ہو گیا۔

شہر در شہر قافلہ در قافلہ:

اس کے بعد امریکا میں مسلمانوں کی آمد کوئنسی Quincy میں ہوئی جو کہ امریکا کے چھٹے صدر جان کوئنسی ایڈمس کی جائے پیدائش ہے۔ 1900 کے اوائل میں شام اور لبنان سے کوئنسی شپ یارڈ میں کام کرنے کے لیے مسلم تارکین وطن آئے۔ اس وقت وہاں عیسائی زیادہ تھے اور عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ سات مسلم خاندان تھے اور محمد قمر اواض نماز میں امامت کیا کرتے تھے۔ بارورڈ یونیورسٹی میں مذہب کے تقابلی مطالعہ کی پروفیسر اور پلورلزم پروجکٹ کی ڈائریکٹر پروفیسر Diana L.Eck کے مطابق 1934 میں مسلمانوں نے ایک تنظیم قائم کی جس کا نام رکھا گیا، ''عرب امریکن بینر سوسائٹی'' شہر کی ساوتھ اسٹریٹ میں وہ یکجا ہوتے، نماز ادا کرتے، جمعہ کی نماز پڑھتے، اپنے بچوں کو اسلامی تعلیم دیتے اور سال میں دو تہوار عید الفطر اور عید الاضحیٰ مناتے۔

تین دہائیوں کے بعد یعنی 1962 میں مسلمانوں نے وہاں ایک مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ 1964 میں مسجد مکمل ہوئی اور پھر اسلام کا بول بالا شروع ہو گیا۔ 1974 تک مسلمانوں کی اس چھوٹی سی آبادی میں تین گنا کا اضافہ ہو گیا۔ 1980 میں مسلمانوں نے ایک بڑا قدم اٹھاتے ہوئے ایک فل ٹائم امام مقرر کرنے کا فیصلہ

کیا اور قرعہ فال نکلا جامعہ از ہر مصر کے تعلیم یافتہ ایک لبنانی مسلمان طلال عید کے نام۔ان کی تقرری میں کوئنسی مسجد کے ساتھ ساتھ مسلم ورلڈ لیگ کی رضا مندی بھی شامل تھی۔ وہ اپنی بیوی، دو چھوٹے بچوں اور ایک اور امام کے ساتھ نیو یارک آ گئے۔ان کا کہنا ہے کہ امریکا میں امامت کرنا لبنان میں امامت کرنے سے بالکل مختلف ہے۔

امریکا میں مختلف مذاہب کی آمد اور ان کے اثر ونفوذ پر 404 صفحات پر مشتمل ایک انتہائی اہم کتاب A New Religious America یعنی ایک نیا مذہبی امریکا کی مصنف ڈائنا ایل اک کے مطابق امریکا میں طلال عید کا رول بہت بڑھ گیا۔ اس کے دو اسباب تھے۔ ایک مقامی مسلمانوں کی توقعات اور دوسرے امریکا میں عام مذہبی رہنماؤں کی توقعات۔ ان کے ہفتہ واری تعلیمی پروگراموں میں جو کہ کوئنسی اور دیگر شہروں میں چلائے جارہے ہیں تین سو سے زائد بچے شامل ہیں، امام عید کی سرگرمیوں میں غیر مسلموں کو اسلام کی تعلیم دینا بین العقائد پروگراموں میں شرکت کرنا، گرجا گھروں اور بودھوں کی عبادت گاہوں میں جا کر لیکچر دینا، کیمبرج سٹی ہال میں سوالوں کے جواب دینا، کوئنسی مسجد میں جمعہ کی نماز میں شرکت کرنا اور چلڈرنس اسپتال سے نرسوں کو لیکر اسلام سے متعلق سیشن کی قیادت کرنا شامل ہے۔

اس درمیان میں بھی مسلمان آباد ہوئے اور ان کی تعداد بڑھتی گئی۔لیکن جس طرح امریکا کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کو خوف و ہراس کے ماحول سے سابقہ پڑتا ہے اسی طرح یہاں کے مسلمانوں کو بھی پڑتا ہے۔1990 میں کوئنسی مسجد میں آگ لگ گئی جس میں پانچ لاکھ ڈالر کی املاک تباہ ہوگئیں۔لیکن جانچ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور نہ ہی کسی کی گرفتاری ہوئی جبکہ یہ آگ آتش زنی کا نتیجہ تھی۔امام عید

کہتے ہیں کہ مشرق وسطی میں یا دنیا میں کہیں بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہوتا ہے اور اس میں مسلمان ملوث ہوتے ہیں تو سب کی نگاہیں ہم لوگوں پر اٹھ جاتی ہیں۔ ہمیں دھمکی آمیز فون اور خطوط ملنے لگتے ہیں اور مشتعل لوگ اسلامک سینٹر کے باہر مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ بقول ان کے اگر کہیں بھی بادل اٹھتا ہے تو بارش ہمارے اوپر ہی ہوتی ہے۔

اس درمیان مسلمانوں نے نئے اسلامک سینٹر کے لیے جگہ کی تلاش شروع کی اور تلخ وشیریں تجربات سے گزرتے ہوئے بالآخر 1993 میں شیرون میں 155 ایکڑ زمین حاصل ہوگئی اور اس طرح 1995 میں یہ اسلامک سینٹر مکمل ہوگیا اور عوام کے لیے کھول دیا گیا۔ اس طرح شیرون نیوانگلینڈ میں واقع اسلامک سینٹر آج امریکا کا بہت بڑا اسلامی مرکز بن گیا ہے۔

غلط فہمیاں بھی بڑھی ہیں:

ڈائنا ایل اک کہتی ہیں کہ میڈیا کے پروپیگنڈہ کے نتیجے میں آج امریکا میں اسلام کے بارے میں ایک منفی رجحان پیدا ہوگیا ہے اور امریکی مسلمانوں کا خیال ہے کہ ان کے بارے میں امریکی معاشرے میں بہت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی لیے مسلمانوں کی جانب سے غیر مسلموں میں زور شور سے اسلام کی تبلیغ ہورہی ہے اور یہ بتایا جارہا ہے کہ اسلام تشدد، دہشت گردی اور نام نہاد جہاد کا مذہب نہیں بلکہ امن وانسانیت اور صلح وآشتی کا مذہب ہے۔ مصنف کا یہ بھی کہنا ہے کہ عیسائی، یہودی اور مسلمان ایک دوسرے کے کزن یعنی رشتے کے بھائی ہیں۔ قرآن میں ابراہیم موسیٰ، عیسیٰ اور مریم کا ذکر ہے۔ لیکن ان بھائیوں میں غلط فہمی بہت ہے اور امریکا میں مسلمان اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتی ہیں

کہ مغربی میڈیا اور معاشرے میں اسلاموفوبیا کا جو ماحول ہے وہ نیا نہیں ہے بلکہ اسکی جڑیں تاریخ میں پیوست ہیں اور یہ 1893 میں بھی موجود تھا جب شکاگو میں عالمی مذہبی پارلیمنٹ منعقد ہوئی تھی۔ ترکی کے خلیفہ نے اس میں اپنا کوئی نمائندہ نہیں بھیجا تھا اور مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والا ایک امریکی مسلمان Mohammad Russell Alixander Webb (محمد رسول سکندر ویب) تھا۔ وہ نیویارک کے ایک اخبار فروش کا بیٹا تھا۔ 1887 تک وہ صحافی کی حیثیت سے کام کرتا رہا اور 1887 میں اسے امریکی قونصل جنرل بنا کر فلپائنس بھیجا گیا تھا۔ وہاں پہلی بار اسلام سے اس کا واسطہ پڑا اور پھر اس نے اسلام قبول کرلیا۔ وہ اس بدگمانی سے واقف تھا جو اسلام کے بارے میں امریکیوں میں موجود ہے۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں امریکیوں سے بڑا امریکی ہوں۔ میں وہ غلطیاں اور بدگمانیاں برسوں تک پالے ہوئے تھا جو آج بھی ہزاروں امریکی پالے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اس نے یہ بھی کہا کہ میرا عقیدہ امریکی دانش، امریکی فراست اور امریکیوں کے جذبہ محبت کے تئیں بھی موجود ہے۔ متعدد حلقوں سے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جس میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک انفارمیشن اینڈ ایجوکیشن شکاگو بھی ہے، جہاں سے کتابیں اور بروشر شائع کر کے تقسیم کئے جاتے ہیں۔ یہ ادارہ ایک بڑے مسلم کمیونٹی سینٹر کے نزدیک واقع ہے اور یہاں سے اسلام کے بارے میں 35 لاکھ کتابیں مفت تقسیم کی جاچکی ہیں۔

اسلامی دعوت کی مہم:

اس ادارے کے بانی ڈاکٹر امیر علی اور ان کی اہلیہ میری علی ہیں جو کہ یورو امریکن ہیں۔ انھوں نے اسلام کے بارے میں لوگوں تک صحیح اطلاعات پہنچانے

کے لیے خود کو وقف کر رکھا ہے۔ انھوں نے ''اسلام آن دی فون'' کے نام سے ایک انفارمیشن لائن قائم کر رکھی ہے۔ یہ ایک کمپیوٹرائزڈ وائس میل سروس ہے اور اس کے ذریعہ اسلام کے تعلق سے سوالوں کے جواب فون پر دیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ لاس اینجلس میں ''دی اسلامک سینٹر آف سدرن کیلی فورنیا'' بھی قائم ہے۔ یہاں سے بھی بروشر اور کتابیں تقسیم کی جاتی ہیں۔

ڈائنا ایل اک کے خیال میں امریکیوں کو اسلام سے متعارف کرانے کی جو سب سے بڑی اور قومی مہم ہے اس کا نام ہے ''اسلام اویئرنیس ویک'' یعنی ''اسلام بیداری ہفتہ'' یہ مہم مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کی جانب سے چلائی جا رہی ہے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے ایک سو سے زائد کیمپس اس سے ملحق ہیں۔ کتاب کی مصنف نے 1994 میں ایسے ہی ایک اسلام بیداری ہفتہ میں شرکت کی جو کہ بوسٹن یونیورسٹی میں منعقد کیا گیا تھا۔ یہ پروگرام ایک بڑے ہال میں تھا جس میں اسٹوڈنٹس کے علاوہ پروفیسر اور ڈین حضرات نے بھی شرکت کی تھی ان میں غیر مسلم بھی تھے۔ اس پروگرام کے دو مقاصد ہیں۔ ایک غیر مسلموں کو اسلام کے بارے میں بتانا اور دوسرا ان مسلمانوں تک اسلام کی صحیح تعلیم پہنچانا جو غیر مسلم ممالک میں رہ رہے ہیں۔ وہاں انھوں نے ڈلہوزی یونیورسٹی ہیلی فکس نووا اسکوٹیا میں مینجمنٹ کے پروفیسر جمال بداوی کی تقریر سنی جس سے وہ بہت متاثر ہوئیں۔ اس وقت وہ شمالی امریکا میں ایک بڑے اسلامی اسکالر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور ان کی متعدد کتابیں اور تقریروں کے کیسٹ تقسیم کئے جاتے ہیں۔ بداوی، نومسلم اسکالر سراج وہاج اور دیگر مقررین نے اسلام کو تشدد اور دہشت گردی سے جوڑنے پر سوال اٹھایا اور پھر تفصیل سے بتایا کہ اسلام دہشت گردی کا نہیں امن و شانتی اور انسانیت کا مذہب ہے اور اس سلسلے میں قرآن کی آیات سے اپنی باتوں کی وضاحت کی گئی۔

تیزی سے مقبول ہونے والا مذہب:

آج اسلام امریکا میں تیزی سے مقبول ہونے والا مذہب بن گیا ہے۔ یہاں ساٹھ لاکھ سے زائد مسلمان آباد ہیں اور ان کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ پورے امریکا میں چودہ سو سے زائد مسجدیں ہیں جن میں سے متعدد انتہائی پُرشکوہ اور اسلامی شان وشوکت کے مظاہر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلام یوں تو پورے مغرب میں پھیلتا جارہا ہے۔ آج پیرس اور لیئیون میں بھی مسجدیں نظر آتی ہیں اور نیدر لینڈ، سویڈن اور روم اور لندن میں بھی۔ فرانس میں مسلمانوں کی تعداد پروٹسٹنٹ عیسائیوں سے زیادہ ہے۔ لندن کے ریجنٹس پارک اور روم میں Tiber کے نزدیک واقع مسجدیں انتہائی عالیشان ہیں۔ اسلامی مراکز کی تعداد بھی بے شمار ہے جہاں سے اسلام کی شعائیں پھوٹ پھوٹ کر پورے امریکا میں اسلامی اجالا پھیلا رہی ہیں۔ ان مسجدوں اور اسلامی سینٹروں نے امریکا کی اسکائی لائن کو ایک نئی جہت دے دی ہے۔ ان میں نیو یارک، اوونگس، میرل، گریٹر ٹولیڈو، کلیو لینڈ، فینکس، Tempe نزد اریزون اسٹیٹ یونیورسٹی، ورجینیا، میٹائری، لوسیانہ، ونڈسر اور واشنگٹن میں واقع مسجدیں اور اسلامک سینٹرس قابل ذکر ہیں۔ اس وقت ہوسٹن میں دو درجن اسلامی مراکز ہیں۔ ان میں سے دس کا الحاق اسلامک سوسائٹی آف گریٹر ہوسٹن سے ہے۔ اس کا قیام 1968 میں ہوا تھا۔ اس مرکز سے مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں میں اسلام کی تبلیغ کی جاتی ہے۔

فلوریڈا میں بھی مسلمانوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ Dade اور Braward کاونٹیز میں پندرہ ہزار مسلمان ہیں۔ اس خطہ میں سب سے پہلے مسجد Pompano Beach جنوبی فلوریڈا میں ایک چھوٹا سا سیامی کی تعمیر ہوئی تھی۔

اسلامی مرکز قائم کیا گیا تھا جو آج کافی وسیع و عریض ہو گیا ہے۔ امریکا میں تقریباً ہر مسجد اپنی ایک الگ داستان رکھتی ہے اور اس کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ وہ پہلے ایک عارضی کمرے میں یا گھر میں بنائی گئی اور پھر رفتہ رفتہ وہ وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔ کونسل آف اسلامک اسکول آف نارتھ امریکا کے مطابق پورے ملک میں دو سو کل وقتی اسلامک اسکول ہیں۔ 1998 میں نیویارک ٹائمز میں شائع ایک مضمون کے مطابق اس وقت صرف نیویارک سٹی میں 23 اسلامک اسکول تھے اور متعدد اسکولوں کی پلاننگ کی جا رہی تھی۔ مین ہٹن میں واقع اسلامک کلچر سینٹر آف نیویارک کے پہلو بہ پہلو ایک اسکول کی تعمیر ہو رہی ہے جس میں ایک ہزار اسٹوڈنٹس اسلامی تعلیم حاصل کریں گے۔ ایک رپورٹ کے مطابق امریکا میں مسلمان ایک اسلامک ایجوکیشن سسٹم پر کام کر رہے ہیں۔

بوسٹن میں سرجن اور ایک مسلم لیڈر میاں اشرف کہتے ہیں کہ انہیں یقین ہے کہ اسلام ایک دن امریکا پر فتح حاصل کرلے گا۔ وہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ امریکا دنیا کا وہ واحد ملک ہے کہ آپ کسی بھی جگہ کھڑے ہو کر کچھ بھی کہہ سکتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ یہاں تعلیم بہت اعلیٰ پیمانے پر ہے۔ ان کے خیال میں یہ آزادی اسلام کے فروغ کے لیے ایک بہت بڑا موقع ہے البتہ مسلمانوں کو اس کے لیے کام کرنا ہوگا۔ ڈائنا اک کے مطابق اسلام امریکا سے جانے کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ یہ تیزی سے بڑھ رہا ہے اور امریکی طرز زندگی کا ایک واضح حصہ بنتا جا رہا ہے۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ امریکا میں اسلام کی تاریخ بہت طویل ہے لیکن گذشتہ تیس برسوں میں اس میں اتنی وسعت آئی ہے اور اس کو اتنا فروغ حاصل ہوا ہے کہ یہاں کے مسلمان امریکا کی مذہبی کمیونٹی میں ایک سرگرم کمیونٹی کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ گرچہ اب بھی امریکی عوام مسلمانوں کو اسٹیریو ٹائپ، لاعلم یا جاہل، بدمزاج،

اکھڑ اور گنوار سمجھتے ہیں لیکن امریکا میں اسلام کا کارواں ان غلط فہمیوں سے لڑتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے اور آثار بتاتے ہیں کہ وہ بہت جلد امریکا کے چند بڑے مذاہب میں سے ایک مذہب بن جائے گا۔

امریکا میں اسلام کی طرف لوگوں کے مائل ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں ہر قسم کی مذہبی سرگرمی کی آزادی ہے اور کوئی بھی شخص اپنے مذہب کی تبلیغ بلا روک ٹوک کرسکتا ہے۔ اس آزادی کا فائدہ مسلمانوں نے بھی اٹھایا ہے اور انہیں مزید اٹھانا چاہئے۔ اس آزادی کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ امریکا میں جگہ جگہ مسجدیں اور اسلامی مراکز قائم ہورہے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ امریکی معاشرہ میں ایک مثالی اسلام پیش کریں تاکہ اسلام کی طرف لوگوں کی آمد کا سلسلہ اور تیز ہوسکے۔ اگر اس مذہبی آزادی کا بھرپور فائدہ مسلمانوں نے نہیں اٹھایا تو حالات ان کے لیے غیر موافق بھی ہوسکتے ہیں اور اس صورت میں کفِ افسوس ملنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہے گا۔

پس نوشت

امریکا میں اسلام

(ایک امریکی صحافی کا تبصرہ)

امریکا میں اسلام کی آمد اور اس کی مقبولیت میں اضافہ سے متعلق اس تفصیل کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں امریکی صحافیوں کی رائے بھی معلوم کر لی جائے۔ کیونکہ بہرحال ہمارا موضوع میڈیا ہے اور اگر اس بارے میں میڈیا کی نمائندگی نہ ہو تو یکطرفہ رپورٹنگ کا الزام عائد ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم ایک امریکی ویب سائٹ World Net Daily.com یعنی ڈبلیو این ڈی پر تین قسطوں میں شائع ایک طویل مضمون کی تلخیص پیش کر رہے ہیں۔ مضمون نگار کا نام ہے شیری گوزیٹ Sherrie Gossett اور یہ تین پانچ اور سات جنوری 2004 کو شائع کیا گیا ہے۔ مضمون کی ابتدا میں تینوں قسطوں کے بارے میں ایڈیٹر کا نوٹ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ امریکا میں سرگرم مسلم تنظیمیں اور سرکردہ مسلم قائدین انتہا پسند ہیں، دہشت گردی اور انتہا پسندی کی حمایت کرتے ہیں اور میڈیا کو شیطان میڈیا کہتے ہیں۔ امریکی میڈیا کی نمائندگی کے طور پر اس طویل مضمون کی تلخیص پیش ہے:

فلوریڈا میں ہونے والی اسلامی کانفرنس ابھی میڈیا تنازعہ سے نکل بھی نہیں پائی تھی کہ اسلامی مقررین اور اسکالروں کی تقریروں سے ایک اور تنازعہ پیدا ہو گیا۔ انھوں نے خودکش بمباروں کی کھل کر حمایت کی اور یہودیوں کو برا بھلا کہہ ڈالا۔ جب وہ تقریر کر رہے تھے تو ہزاروں کی تعداد میں سامعین ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ حالانکہ کانفرنس سے قبل اسلامی لیڈر ڈاکٹر سید ایم سعید نے میڈیا کو یقین دلایا تھا کہ کانفرنس میں صرف مین اسٹریم کے اماموں کو مدعو کیا گیا ہے اور ''گمراہ اماموں'' کو دعوت نہیں دی گئی ہے۔ اس کانفرنس میں مکہ کے امام شیخ عبدالرحمٰن السدیس کو بھی آنا تھا، لیکن میڈیا میں رپورٹیں آنے کے بعد ان کا نام ہٹا دیا گیا۔ خیال رہے کہ السدیس نے گذشتہ سال مکہ میں بیس لاکھ مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ سے دعا کی تھی کہ وہ یہودیوں کو فنا کر دے۔ انھوں نے یہودیوں کو خوب برا بھلا کہا تھا۔ بعد میں امام سراج وہاج کا بھی نام ہٹا دیا گیا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ سراج وہاج کا نام 1993 میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں دھماکے میں شامل تھا مگر ان کے خلاف ثبوت نہ ہونے کے سبب انہیں بری کر دیا گیا۔ دوپہر میں اوک لینڈ کیلی فورنیا کی مسجد الاسلام کے امام شیخ عبدالملک نے تقریر کی، انھوں نے کہا کہ وہ اقوام متحدہ میں سفارتکاروں سے خطاب کر کے ابھی ابھی واپس آئے ہیں۔ اس سے قبل اپنی تقریروں میں انھوں نے خودکش بمباروں کی حمایت کی تھی اور گیارہ ستمبر کے حملوں میں مسلمانوں کے ملوث ہونے کی تردید کی تھی۔ انھوں نے دہشت گردی مخالف جنگ کو ایک صہیونی سازش قرار دیا جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنا ہے۔

اس سے قبل ڈاکٹر ایس ایم سعید نے جو کہ اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا کے سکریٹری جنرل ہیں، کہا کہ کانفرنس نے ہم کو غیر معمولی موقع فراہم کیا ہے۔ یہاں عوام اور میڈیا والے آئے ہیں یہ جاننے کے لیے کہ ہم کیا کہتے ہیں۔

انھوں نے انتہا پسندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم اپنا اسٹیج انہیں نہیں دیں گے۔ ہمیں حساس اور ذمہ دار بننا ہے۔ گمراہ ائمہ اسلام کی نمائندگی نہیں کرتے۔ ہمیں واضح طور پر اعلان کرنا چاہئے کہ وہ ہماری اور ہمارے رسول کے پیغام کی نمائندگی نہیں کرتے جو کہ رحمت للعالمین ہیں۔ اگلے روز اعلان کیا گیا کہ مصری عالم دین شیخ وجدی غنیم خطاب فرمائیں گے۔ مگر وہ شہر میں ہوتے ہوئے بھی کانفرنس گاہ تک نہیں آئے۔ اس سے قبل وہ یہودیوں کو قابل اعتراض انداز میں یاد کر چکے تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہودی الفاظ کو توڑ مروڑ کر بے معنی کر دیتے ہیں۔ انھوں نے نبیوں کا قتل کیا اور بتوں کی پوجا کی۔ اس موقع پر شیخ غنیم کی تقریروں کی سی ڈی فروخت ہوتی رہی۔

ادھر شیخ عبد الملک نے اپنی تقریر میں اوکلا ہو ماسٹی میں بم دھماکوں پر میڈیا رپورٹوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ امریکا میں میڈیا مسلمانوں سے تعصب رکھتا ہے۔ جولائی 1999 میں سان فرانسسکو میں ایک بڑی ریلی ہوئی تھی جس میں شیخ ملک نے بھی دہشت گرد گروپ حماس کی مدح سرائی کی تھی۔ (اس کے بعد حماس تنظیم کے خودکش حملوں، ان میں ملوث نوجوانوں کے اہل خانہ کی مدد اور حماس کے لیے فنڈ کی فراہمی وغیرہ سے متعلق کافی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔)

''اسلام برائے انسانیت'' کے زیر عنوان منعقدہ اس کانفرنس میں اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا یا اسنا کی قیادت موجود تھی جن میں اسلامک سوسائٹی آف اورینج کاونٹی کیلن کے ڈائریکٹر ڈاکٹر مزمل صدیقی اور اسنا کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر ایس ایم سعید قابل ذکر ہیں۔ مزمل صدیقی نے اسرائیل کو جاری امریکی حمایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ ناانصافی کی حمایت کرتے رہیں گے تو اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔ اس سے قبل 28 اکتوبر 2000 کو واشنگٹن میں یوم یروشلم

ریلی میں انھوں نے تقریر کرتے ہوئے یہودیوں اور میڈیا پر نکتہ چینی کی تھی۔ کانفرنس میں کونسل آن امریکن اسلامک ریلیشن یا CAIR کے سراج وہاج نے اپنے پیروکاروں سے کہا کہ وہ امریکی حکومت کا تختہ پلٹ دیں اور اسلامی ڈکٹیٹرشپ قائم کریں۔ اسنا نے جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد کے ساتھ ساتھ انقلابی خطیب اور دہشت گردوں کے حامی شیخ یوسف القرضاوی کو بھی مدعو کیا تھا، جو کہ اخوان المسلمون کے ایک معروف نظریہ ساز ہیں۔ جس نے اسلامی جہاد، حماس، القاعدہ اور دیگر دہشت گرد گروپوں کو پیدا کیا ہے۔ القرضاوی اسلام کی اپنی انقلابی تشریح کی مدد سے خودکش بمباری کو جائز ٹھہراتے ہیں۔ انھوں نے فتویٰ دیا ہے کہ حماس کی کارروائیاں جہاد ہیں اور جو لوگ جہاد میں ہلاک ہوتے ہیں وہ شہید ہیں۔ کانفرنس کے موقع پر یوسف القرضاوی کی سی ڈی اور کتابیں بھی فروخت ہورہی ہیں۔ کانفرنس میں اخوان المسلمون کے کئی رہنماؤں کو مدعو کیا گیا ہے جن میں رشید غنوشی بھی ہیں جو کہ اسلامی ٹنڈنسی موومنٹ تیونس کے جلاوطن رہنما ہیں۔ انھوں نے اپنے خطاب میں اسرائیل کو کینسر اور یہودیوں کو شیطان قرار دیا۔

(اس دوسری قسط میں حماس کے رہنما موسیٰ ابو مرزوق، شیخ احمد یاسین، عزالدین القسام برگیڈ، اسلامک جہاد موومنٹ آف فلسطین، رمضان عبد اللہ صلاح، بشیر النافع، حزب اللہ، شیخ عمر عبدالرحمٰن، شیخ عبدالعزیز اور دیگر علماء اسلامی قائدین اور اسلامی تنظیموں کا مفصل ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح حماس اور دیگر گروپ خودکش بمباری اور دہشت گردی میں ملوث ہیں اور مسلم علماء ان کی حمایت کرتے ہیں۔ تیسری قسط میں امریکا میں مساجد کے بارے میں ہے اور کہا گیا ہے کہ آج امریکا کی بیشتر مساجد پر اعتدال پسندوں کے بجائے انتہاپسندوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔)

اسلامک سرکل آف نارتھ امریکا یا اکنا، اسنا اور CAIR امریکا میں سب سے بڑی مسلم تنظیمیں ہیں جن میں انقلابی علما اور نظریہ سازوں کی خاصی موجودگی ہے۔ کمیونٹی لیڈر، دہشت گردی کے ماہرین اور مشرق وسطیٰ کے جانکار کہتے ہیں کہ یہ گروپ اپنی انقلاب پسندی کو دوسروں کی آنکھوں سے اوجھل رکھتے ہیں تا کہ میڈیا میں ان کی مثبت کوریج ہو۔ جس کا بعد میں وہ استحصال کر سکیں۔ وہ خود کو اعتدال پسند کے طور پر پیش کرتے ہیں اور امریکا میں مسلمانوں کے معاملات کو مبالغہ آرائی کے ساتھ بتاتے ہیں۔ وہ عدم رواداری، تعصب اور جانبداری کے الزامات اس لیے لگاتے ہیں تا کہ وہ خود کو مسلم نوجوانوں کا محافظ بتا سکیں۔ یہ لوگ میڈیا میں اپنی جگہ بنانے کے بعد اصل اعتدال پسندوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور انہیں دھمکی دیتے ہیں کہ وہ خاموش رہیں۔ جب ان پر نکتہ چینی کی جاتی ہے تو ان کے پیروکار اسے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نکتہ چینوں کو جس بات سے تشویش ہے وہ یہ ہے کہ یہ مسجدوں سے اعتدال پسندوں کو کھینچ کر باہر اور اپنے لوگوں کو اندر کر رہے ہیں۔ بعض مسلم لیڈران یہ شکایت کرتے ہیں کہ اسی فیصد مسجدوں اور اداروں کے مالک یہی انتہا پسند بن گئے ہیں جو امریکا میں مسلمانوں کی معمولی سی اکثریت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اعتدال پسند مسلمانوں کو پریشانی یہ ہے کہ ان انتہا پسند گروپوں کو اعتدال پسند گروپ کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ ایک اعتدال پسند مسلم امریکی اور ایک اخبار کے پبلیشر مرحوم سیف اشماوی کا کہنا تھا کہ انقلابی اسلامی گروپوں نے امریکا میں مین اسٹریم اسلامی اداروں کی قیادت سنبھال لی ہے۔ ایک صوفی اور اعتدال پسند جمال الدین ہوف مین کے مطابق یہ صورتحال ہمارے مذہب کے قلب و روح کے لیے جنگ جیسی ہے۔ ہوف مین پبلک افیئرس فار دی اسلامک سپریم کونسل آف امریکہ کے ڈائریکٹر ہیں۔ اس ادارے کا دہشت

گردی کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ ادارے کے چیئر مین شیخ محمد ہشام کبانی نے گذشتہ سال انڈونیشیا کی استقلال مسجد میں جو کہ دنیا کی تیسری بڑی مسجد اور سات عجائبات میں سے ایک ہے، خطاب کرتے ہوئے وہاں موجود ایک لاکھ مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ رسول اکرم کی صحیح تعلیمات امن ورواداری اور دوسروں کے احترام کے پیغام کی اصل روح کو سمجھ کر اسلام میں واپس آجائیں۔ ان کے اس پیغام کو انڈونیشیا کے ٹیلی ویژن سے نشر کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ آج اسلام کو خود ساختہ کارکنوں سے خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ انھوں نے پورے امریکا میں اسلامی سینٹروں کا دورہ کر کے اپنا یہ پیغام پہنچایا۔ اس کے علاوہ تھائی لینڈ، سنگاپور، مراکش اور ملیشیا میں بھی انھوں نے روحانیت اور خیر سگالی کی تبلیغ کی، دراصل ان مسلم انتہا پسند گروپوں کا نصب العین انتہا پسندی ہے۔ وہ انتہا پسند اسلام پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور امریکی مسلمانوں کو یہ بتا رہے ہیں کہ یہی ایک راستہ ہے دوسرا کوئی نہیں۔

ماخذ

(1) **COVERING ISLAM**

ADWARD W. SAID

(2) **INTERPRETING ISLAM**

HASTINGS DONNAN

(3) **ANEW RELIGIOUS AMERICA**

DIANA L. ECK

(4) **WHO SPEAKS FOR ISLAM**

PROFESSOR JOHN L. SPOSITO

DALIA MOGAHED

(5) **WESTERN MEDIA AND ITS IMPACT**

NAZRUL HAFEEZ NADVI

(6) **MAKKAH DECLARATION 2008**

(7) بین المذاہب مذاکرات

ڈاکٹر ہشیم الکیلانی

(8) تہذیبوں کے درمیان تصادم وتفاہم ۔ اسلامی نقطۂ نظر

ڈاکٹر محمد عرفات القاضی

ڈاکٹر محمد عابد الجابری

(9) تہذیبی مذاکرات کی اسلامی تاریخ
زکی المیلاد

(10) تہذیبوں کے باہمی تعلقات۔ مفاہمت و مذاکرات
زکی المیلاد

(11) کشمکش اور مذاکرات کے تناظر میں تہذیبوں کا مستقبل
ڈاکٹر عبدالمجید عمرانی

(12) رسالہ الجین

(13) انگریزی، اردو اور ہندی کے اخبارات ورسائل
اور انٹرنیٹ سے استفادہ۔



MAGRIBI MEDIA AUR ISLAM

میری رائے میں اس کتاب کو اردو سے زیادہ انگریزی اور ہندی میں آنا چاہئے تا کہ انگریزی اور ہندی سے جڑے ہوئے میڈیا کے لوگ اس کے آئینے میں اپنا حقیقی چہرہ دیکھ سکیں اور انہیں بھی معلوم ہو کہ کہتی ہے ان کو خلق خدا غائبانہ کیا۔

پروفیسر اختر الواسع

سہیل انجم کی یہ کتاب اس لئے بھی قابل قدر ہے کہ یہ ہمیں ان حقائق سے آگاہ کرتی ہے جن کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی مستند نہیں ہیں افراط وتفریط کا شکار ہیں۔

ابن احمد نقوی

ابھی تو مغربی میڈیا کی چیرہ دستیاں جاری ہیں۔ سہیل انجم نے بر وقت اس موضوع پر اتنی اہم کتاب لکھی ہے اور بلا شبہ اردو میں اس موضوع پر لکھی جانے والی یہ پہلی کتاب ہے۔ ان کا انداز تحریر بھی دل کش ہے جس کی یکسانیت شروع سے آخر تک جاری رہتی ہے۔

ڈاکٹر رضوان احمد

Al-Kitab International الکتاب انٹرنیشنل
Jamia Nagar, New Delhi-25
Ph.: 26986973 M. 9312508762